ناصر کاظمی

کی شاعری میں پیکر تراشی

سمیّہ تمکین

ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر تراشی

سمیہ تمکین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

NASIR KAZMI KI SHAIRI MEIN
PEEKAR TARASHI

by

SUMAYYA TAMKEEN

Year of Edition 2013
ISBN 978-93-5073-183-3
₹ 250/-

کتاب : ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر تراشی
مصنفہ : سمیہ تمکین
پتہ : مکان نمبر:10-2-318/1/7، وجے نگر کالونی، حیدرآباد
Mob:9573969108, E-mail:sumayya040@gmail.com :
اشاعت : ۲۰۱۳ء
قیمت : ۲۵۰ روپے
تعداد : ۵۰۰
کمپوزنگ : تنویر گرافکس، چندرائن گٹہ، حیدرآباد، 7207838273
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

میں اپنی یہ پہلی ادبی کاوش
والدِ محترم جناب محمد شریف صاحب
والدۂ محترمہ شاہدہ سلطانہ
اور
میرے اساتذۂ کرام
جناب عبدالغنی نعیم خاں مرحوم
پروفیسر مظفر علی شہ میری
کے نام معنون کرتی ہوں
جن سے میری زندگی عبارت ہے

فہرست

پیش گفتار

ناؔصر کاظمی ایک عہد ساز شاعر تھے۔ انھوں نے اردو غزل کو اسلوب کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ انھوں نے داخلی جذبات اور محسوسات کی پیشکش کے لیے خارجی دنیا اور مظاہر فطرت سے حسّی پیکر تراشے اور ان کی باہمی ترکیب اور امتزاج سے ایک نئی دنیا آباد کی۔ پیکر تراشی کا یہ اسلوب ناؔصر کاظمی کی غزلیہ شاعری سے مخصوص ہے۔ کسی اور شاعر نے اتنے وسیع پیمانے پر پیکر تراشی سے کام نہیں لیا۔

سمیہ تمکین نے اپنے مقالے میں ناؔصر کاظمی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی پیکر تراشی پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ناؔصر کاظمی کے اشعار میں بیشتر مرکب پیکر ملتے ہیں جو بہ یک وقت قاری کے مختلف حواس کو متوجہ کرتے ہیں۔

سمیہ تمکین نے اپنے موضوع سے پورا انصاف کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مقالے کو کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ اردو کے باذوق قارئین استفادہ کرسکیں۔

مغنی تبسم

پروفیسر مغنی تبسم کی یاد میں

یہ کچھ سات سال پرانی بات ہے، جب میں نیا نیا حیدرآباد آیا تھا اور پروفیسر مغنی تبسم کے دولت کدے پر ان سے محو گفتگو تھا۔ پروفیسر موصوف نے بر سبیل تذکرہ عرض کیا کہ انھوں نے کسی ریسرچ اسکالر سے ناصر کاظمی پر کام کرانے کی کوشش کی تھی مگر کسی وجہ سے وہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ پھر آپ نے اس خاکسار سے خواہش کی کہ اگر کوئی لائق اسکالر مل جائے تو میں یہ کام کرادوں۔ میں نے ہامی بھر لی اور ایک ایسے ریسرچ اسکالر کا انتظار کرنے لگا، جس کا شعری ذوق عمدہ ہو اور وہ محنتی بھی ہو۔ تلاش بسیار کے بعد میری نظر عزیزہ سمیہ تمکین پر ٹھہری، مجھے ان میں مذکورہ دونوں خوبیاں نظر آئیں۔ لہٰذا میں نے یہ کام انھیں سونپ دیا اور انھوں نے دل لگا کر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مجھے ذاتی طور پر خوشی اس بات کی ہے کہ میں پروفیسر مغنی تبسم کا حکم بجا لا سکا اور ان کی دیرینہ آرزو کو پورا کر سکا۔

سمیہ تمکین (جے آر ایف سند یافتہ) کو جب ایم فل کی سند مل گئی تو انھوں نے اپنے مقالے کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ پروفیسر مغنی تبسم سے مل کر ان کی رائے معلوم کر لیں۔ چناں چہ انھوں نے اپنا مقالہ پروفیسر مرحوم کی خدمت

میں پیش کیا۔ آپ نے نہ صرف مقالے کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا، بلکہ اکثر جگہوں پر حک و اصلاح کر کے اسے خامیوں سے پاک بھی کیا۔ ان کا کرم یہیں ختم نہ ہوا۔ سمیہ تمکین کی درخواست پر انھوں نے اس کتاب کا پیش لفظ بھی تحریر فرمایا اور یوں موصوف نے اس کتاب کے وزن وقار میں اضافہ فرمایا۔ ہم سب دست بہ دُعا ہیں کہ اللہ مرحوم کو اپنی بے پناہ قربتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین

پیکر تراشی پر کام کرنا کارِ دشوار اس لیے تھا کہ اردو میں اس پر خاطر خواہ مواد موجود نہیں ہے۔ سمیہ تمکین نے پہلے، اردو میں موجود مواد سے استفادہ کیا، بعد ازاں انگریزی کتابوں سے مستفیض ہوئیں۔ آج کل انٹرنیٹ پر بھی بہت کچھ مل جاتا ہے مگر اس کے استناد کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ بایں وجہ سمیہ تمکین نے انٹرنیٹ سے مواد اخذ کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ تمام معلومات کی فراہمی کے بعد انھوں نے سلیقے کے ساتھ مواد کو ترتیب دیا اور اپنی رائے قائم کی۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا مگر وہ آسانی کے ساتھ پار کر گئیں۔

فن پیکر تراشی کی تفہیم و توضیح کے بعد مرحلہ تھا اس تناظر میں ناصؔر کاظمی کی شاعری کو سمجھنے کا۔ چناں چہ سمیہ تمکین نے اس خصوص میں، پیکر تراشی اور اس کی مختلف قسموں کو ثابت کرنے کے لیے ناصؔر کاظمی کے علاوہ اردو کے کئی شعراء کے بیسیوں اشعار کا انتخاب کیا۔ پھر ان میں سے عمدہ اشعار کو چھانٹ کر پیکر تراشی اور اُس کی گوناگوں قسموں کو استناد واستحکام عطا کرنے کے باوصف ناصؔر کاظمی کی شاعری کے اس اہم پہلو کو روشن اور اجاگر کیا۔ اس طرح یہ کتاب اس موضوع پر دستاویزی اہمیت کی حامل بن گئی ہے۔

ہمیں عزیزہ سمیہ تمکین سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ خدا کرے کہ وہ خدمتِ اردو کو اپنا وتیرہ بنالیں، محنت کرتی رہیں اور یوں ہی اپنا، اپنے والدین اور اپنے شعبے کا نام روشن کرتی رہیں۔ آمین!

حیدرآباد

۷/ فروری ۲۰۱۳ء

مظفر شہ میری

پروفیسر و صدر شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حرفِ آغاز

میں اللہ رب العزت کے دربار میں سجدۂ شکر بجالاتی ہوں کہ اس نے مجھے طلب علم کی راہ پر لگایا اور میرے اندر تحصیلِ علم کے لیے جہد و محنت کا شوق پیدا کیا۔ یہ بھی اسی خالق کائنات کا کرم ہے کہ مجھ جیسی ناچیز سے اس ادنیٰ سے کام کی تکمیل کرائی اور آپ کے روبرو پیش کرنے کی سعادت بخشی۔

یہ تو اس کی ہی اک عنایت ہے
ورنہ میں کیا، مری حقیقت کیا

(عثمان شاہین)

مجھے شاعری سے ازحد شغف اور دلچسپی ہے۔ میں، شعر و ادب کو سماج کا آئینہ مانتی ہوں اور شاعری میں زندگی اور انسانی سماج کی بکھری ہوئی گوناگوں تصویروں کو دیکھ کر محظوظ ہوتی ہوں۔ ادب خلا میں نہیں پیدا ہوتا، وہ ہمارے ہی سماج میں تخلیق پاتا ہے۔ اردو میں ایسے شعرا کی کمی نہیں ہے، جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانی سماج کی عکاسی نہ کی ہو۔ ناصر کاظمی کا شمار ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے۔ جب میرے یم فل کے موضوع کے انتخاب کی بات نکلی تو میرے نگران کار پروفیسر مظفر شہ میری نے مجھے ناصؔر کاظمی کی پیکر تراشی پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے فوراً اس موضوع پر کام کرنے کی

رضامندی ظاہر کردی اور میرا موضوع 'ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر تراشی' طے پایا۔

1960ء کے بعد اردو ادب میں جو رجحانات در آئے ان میں پیکر تراشی کا رجحان بھی تھا، جو ایک رجحان بھی ہے اور شعری تکنیک بھی۔ دونوں کے بارے میں اردو میں مواد کی کمی ہے۔ میں نے بساط بھر کوشش کی ہے کہ مختلف حوالوں سے پیکر تراشی کی ازسرِ نو شناخت قائم کروں، اُس کی اقسام کا احاطہ کروں و نیز نت نئے نام دے سکوں اور پھر اس تناظر میں ناصر کاظمی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لوں۔ تاہم مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ یہ محض ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔

جہاں تک شکریہ ادا کرنے کی بات ہے، میں سب سے پہلے اپنے والدین کی خدمت میں اظہارِ ممنونیت کرنا چاہوں گی، جنھوں نے مجھے زیورِ علم سے بہرہ ور کیا۔ ان کی سرپرستی، مشفقانہ رہ نمائی اور محبت نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ میں قدیر انصاری کے اس شعر کو ترمیم کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں ؎

میرے ابو اور امی نے کیا کامل مجھے
بیٹھنے کے کردیا ہے چار میں قابل مجھے

میں اپنی بہن بھائیوں اور دیگر افرادِ خاندان کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی حاصل رہی۔

قابلِ صد احترام استادِ محترم مرحوم غنی نعیم خاں کا شکریہ مجھ پر واجب ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے میرے اندر شعر و ادب کی تفہیم کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

پروفیسر مغنی تبسم مرحوم کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے کہ انھوں نے میرے مقالے پر نظرثانی فرمائی اور اس کتاب کا پیش لفظ تحریر کر کے میری ہمت افزائی فرمائی۔

اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

میں اپنے استادِ محترم پروفیسر مظفر شہ میری کی ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی نگرانی میں یم فل کا مقالہ لکھنے کے لیے منتخب کیا، قدم قدم پر نگرانی فرمائی اور شروع ہی سے اس مقالے کی اشاعت کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ یہ ان کی حوصلہ افزائی ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ مقالہ زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ آپ کی محبتوں اور عنایتوں کے لیے 'شکریہ' جیسا لفظ کتنا ناکافی لگ رہا ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہے

پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر محمد انور الدین اور ڈاکٹر حبیب نثار اور شعبۂ اردو کے دیگر اساتذۂ کرام کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق اپنے مشوروں سے نوازا۔

انوار العلوم کالج، حیدرآباد کی وائس پرنسپل محترمہ آمنہ انصاری، صدر شعبہ اردو جناب شیخ سلیم، انگریزی کے استاد ڈاکٹر ستیہ نارائن کے علاوہ جناب غوث الحسن، ڈاکٹر فخر عالم اعظمی اور کالج کے دیگر اساتذہ کی میں ہمیشہ ممنون رہوں گی جنھوں نے میری تربیت فرمائی۔

معروف شاعر قدیر انصاری مرحوم کے ساتھ ساتھ پروفیسر قاسم علی خان کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے دورانِ تحقیق مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔

میں تمام کتب خانوں کے سربراہوں، خاص طور پر ادارۂ ادبیات اردو کے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں کہ جن کے تعاون کے بغیر بعض اہم کتابوں تک میری رسائی محال تھی۔

میں اپنی سہیلی رضیہ بیگم کا جو میری ہم جماعت بھی ہے، ہم دم بھی اور میری ہم نوا بھی، شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے آغازِ تحقیق سے لے کر اشاعتِ کتاب تک میرے ساتھ سایے کی طرح رہیں اور کاموں میں میرا ہاتھ بٹاتی رہیں۔

ان کے علاوہ سید جمال اللہ باشاہ حسینی، جے محمد شفیع، سعید صاحب، ادریس ربانی، بشیر النساء، جویریہ فاطمہ، فرحین سلطانہ، وسیم سلطانہ، روحینہ فاطمہ اور تمام احباب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق میرے ساتھ محبت اور اخلاص کا معاملہ رکھا۔

مقالے کی کمپوزنگ کے لیے جناب خلیف کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے محدود و مقررہ وقت میں یہ کام مکمل کیا اور کتاب کی کمپوزنگ کے لیے میں جناب خالد کی شکر گزار ہوں۔

۱۵/فروری ۲۰۱۳ء

سمیہ تمکین

پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدر آباد

باب اول

ناصر کاظمی : ماحول اور شخصیت

ماحول

شاعر اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ان تبدیلیوں سے اس کا مکمل طور پر واقف ہونا اس کے شعور کی فعالیت کو ظاہر کرتا ہے اور یہیں سے وہ تجربہ پسندی کے لیے وجہ تلاش کرتا ہے اور اپنی شاعری میں اس کو برتتا ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد جب زندگی نئی تشکیل کی طرف متوجہ ہونے لگی تو صورتِ حال زیادہ امید افزا نہ تھی۔ تقسیم کے پہلے کے نمایاں شعری رجحانات مثلاً وطنیت، رومانیت، عشق اور انقلابیت وغیرہ کافی پرانے ہوگئے تھے۔ تقسیم کے واقعہ نے انسانی ذہن کو درہم برہم کر دیا تھا، تقسیم ہند سے پہلے کے شعرا کی شاعری ایک گھٹی ہوئی چیخ بن کر رہ گئی اور جو نئی نسل کے شعرا تھے وہ محض اپنے زخموں کا شمار کرنے میں لگے ہوئے تھے! لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ان شعرا میں ایک ایسا شاعر بھی موجود تھا جو ساری فضا کو روشن کرنے کا وصف رکھتا تھا اور وہ تھا ناصؔر کاظمی۔۔۔ ناصر کاظمی تقسیم کے بعد اردو شاعری کو ایک نیا تخلیقی مزاج عطا کرنے میں پیش رو کا درجہ رکھتے ہیں۔

ناصر کاظمی سیدھی سادھی زندگی گزارنے کے لیے اس دنیا میں تشریف لائے تھے مگر تقسیم کے المیہ نے ناصر کاظمی کے خوابوں کو تہس نہس کر ڈالا۔ یہ واقعہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور حیات شکن واقعہ تھا۔ اس واقعہ نے ان کے ذہن پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے۔ جس کے تعلق سے سلیم احمد لکھتے ہیں:

''ناصر کی شاعری اور ہجرت کی واردات ہمارے تصور
پر ایک ساتھ وارد ہوئی۔''[۲]

ناصر کاظمی کی زندگی میں ایک بہت بڑا جذباتی حادثہ رونما ہوا جسے انہوں نے اپنی تخلیقی قوت بنالیا یہ صرف ایک شخص کا المیہ نہ تھا بلکہ ایک پوری تہذیب وثقافت کا المیہ تھا۔
ناصر کاظمی کے یہاں ۱۹۴۷ء کے فسادات، تقسیم اور ہجرت کے المیہ نے اہم کردار ادا کیا:

''آزادی کے بعد ہجرت کے تجربے نے کئی صورتیں
اختیار کیں، کہیں تو ہمیں صرف جغرافیائی ہجرت کا تجربہ
ملتا ہے۔ لیکن اس سے بھی شدید تر وہ ہجرت تھی جو
شاعر کا بنیادی اکیلا پن ہے جسے روحانی ہجرت کہا
جاسکتا ہے۔ اس سفر میں غزل نے بھی ہجرت کی۔ یہ
ہجرت غزل کی ترقی کا وسیلہ بنی کیوں کہ ترقی ہجرت
کے بغیر ممکن ہی نہیں۔''[۳]

ناصر کاظمی کے لیے ہجرت محض انفرادی دکھ کا نام نہ تھا بلکہ یہ اجتماعی زندگی کی تباہی، پامالی اور دردناکی کی داستان تھا۔ ان کے دل ودماغ کی آسودگی جوان کے ماحول کی دین تھی وہ ان واقعات کی وجہ سے درہم برہم ہوگئی وہ جلتے گھروں، اجڑے شہروں،

لٹتی عصمتوں اور سڑتی لاشوں سے گزر کے آئے تھے۔ لیکن یہ ان کی دردناک داستان کا نقطۂ آخر نہ تھا۔ بلکہ اس کے بعد لاہور کی اجنبی فضاؤں میں اکیلے پن، تنہائی اور اداسی کا عذاب بھی ان کا مقدر تھا۔

ناصؔر کاظمی ہجرت کے بعد نئے شہر کے نئے حالات سے مکمل طور پر ذہنی مطابقت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ بے روزگاری، آوارگی، شب بیداری اور لاپرواہی کے ساتھ ساتھ مشکلوں میں گزارا۔ ناصؔر ان حالات میں ایک اجنبی مسافر کی طرح نامعلوم منزل کی تلاش میں رہے اور بھٹکتے رہے۔ کبھی کبھی موہوم سی امیدوں کا وقت بھی آیا مگر وہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔

ناصؔر کاظمی کا تخلیقی سفر جو کہ ہجرت کے نتیجے میں شروع ہوا تھا وہ نئے حالات سے مطابقت پیدا نہ کرسکا۔ ان کا سارا دھیان وہیں اٹکا ہوا تھا جہاں وہ جلتے خیمے چھوڑ کر آئے تھے۔ جس کی وہ بازیافت چاہتے تھے۔

دھیان کے آتش داں میں ناصؔر
بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے

یوں ماضی کے ساتھ ان کا جذباتی رشتہ اور زیادہ مضبوط ہوگیا۔ ان کا وہ باطن جہاں جنگل ہرے بھرے تھے، جہاں پھول گاتے تھے تو دوسری طرف ہجرت کا سفر تھا جو شکست کا سفر ثابت ہوا۔

ایک ہری کونپل کے لیے
میں نے چھوڑے کتنے پھول

اونچے اونچے لمبے پیڑ
سادے پتے پیلے پھول

نہر کیوں سو گئی چلتے چلتے
کوئی پتھر ہی گرا کر دیکھو

ناصؔر کاظمی کے یہاں احتجاج کی نوعیت سیاسی نہیں بلکہ ذاتی اور انسانی نظر آتی ہے جس کا اندازہ ناصؔر کاظمی کی اس غزل سے لگایا جاسکتا ہے ؎

رہ نوردِ بیاباں غم صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم صبر کر صبر کر

اس غزل کے مطالعہ سے ہجرت کا المیہ اور ذہنی و جذباتی جلاوطنی کے احساس کی اذیت نگاہوں کے سامنے متحرک ہوجاتی ہے۔

ناصؔر کاظمی کے یہاں سیاسی احتجاج کی مثالیں وافر مقدار میں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کی تنہائی، اجنبیت، یادِ ماضی، بے رخی و بے دلی اور ہجرت کے عذاب کو جس طرح سے محسوس کیا اس کا اندازہ ان کی شاعری سے لگایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ؎

اجنبی شہر لوگ نامانوس
کیا سنے کوئی کیا کہے کوئی

ناصؔر کاظمی نے میرؔ کی ہجرت کے تجربے کو تقسیم ملک کے بعد کی ہجرت کے تجربے میں محسوس کیا اور اس سے نئے ذہنی و جذباتی تاثرات بھی اخذ کیے۔

ناصؔر کاظمی تقسیم کے خلاف نہیں تھے بلکہ تقسیم کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوگئے تھے وہ انھیں ویران کر گئے تھے ؎

کھویا ہے جسے اس کا بدل کوئی نہیں ہے
یہ بات مگر کون سنے لاکھ پکارو!

رودادِ سفر نہ چھیڑ ناؔصر

پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

ناؔصر کاظمی کی شاعری زوال پذیر تہذیب سے تعلق رکھتی ہے جہاں اقدار دم توڑ رہی ہیں، انسانیت ختم ہو رہی ہے، زندگی بے معنی ہوتی جا رہی ہے، خوشی، سکون اور آسودگی ایک ایسے خواب کی مانند نظر آ رہے تھے جس کی تعبیر کبھی ممکن نہ تھی۔[5] اس کے باوجود ناؔصر پُر مسرت زندگی کے خواب ضرور دیکھتے ہیں مگر جب حقائق پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں مایوسی ہوتی ہے۔

آرائش خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو

وہ درد اب کہاں جسے دل چاہتا بھی ہو

ناؔصر کاظمی کے یہاں ۱۹۴۷ء کی سیاسی واردات ایک تہذیبی المیے کے تناظر میں نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی جانب اشارے میؔر نے دلّی کی بربادی کے ساتھ دل کی ویرانی کے ذکر میں کئی بار کیا ہے۔

وہ ادیب یا شاعر، جو پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے، انھیں تہذیبی بحران کے اس تجربے سے دوچار نہیں ہونا پڑا، جس کا شکار ہندوستان سے پاکستان آنے والے شاعر یا پہلے ہی سے مقیم ادیب ہوئے۔ مثال کے طور پر ۔

آج غربت میں بہت یاد آیا

اے وطن تیرا صنم خانہ گل

چلے تو ہیں جرسِ گل کا آسرا لے کر

نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

ان کے یہاں جو احتجاج نظر آتا ہے، نہ ہی اس کی سمت متعین ہے اور نہ اس کی

نوعیت۔ کہیں یہ احتجاج اداسی کی شکل میں ہے تو کہیں اضطراب میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کہیں ایک جدید جذباتی وابستگی کی شکل میں نظر آتا ہے اس احتجاج کا مقصد کسی نظریے سے وابستگی کا اعلان نہیں ہے بلکہ زندگی کی کھردری اور واضح حقیقتوں کا تخلیقی اظہار ہے۔

ناصؔر کاظمی ایک سچے شاعر کی طرح حقائق بیان کرنے میں کسی قسم کی مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے جس کی وجہ سے جہاں ان میں حال سے متعلق بے اطمینانی پائی جاتی ہے وہیں وہ ایک خوش حال مستقبل کی بشارت بھی دیتے ہیں۔ ناصؔر کاظمی کو یقین ہے کہ حالات بدلیں گے اس لیے وہ سب کو آواز لگا کر بیدار کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

شہر اجڑے تو کیا ہے کشادہ زمین خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو
اے ہم سفرو، آواز ذرا کچھ کہتی ہے

جب وہ اپنے لوگوں کو یاد کرتے ہیں تو ایسے جذبات نمایاں ہوتے ہیں جو ان کے جسم کے ساتھ ساتھ ان کی روح کی پکار بھی معلوم ہوتے ہیں۔

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں سماجی حالات کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔

پہنچے گور کنارے ہم
بس غم دوراں ہارے ہم

معلوم ہوتا ہے کہ ناصؔر کاظمی عشق کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی حالات کا گہرا شعور، زندگی کی کشمکش اور غم دوراں کا خیال بھی اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں

دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں رومان اور حقیقت کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔

ایک ایسا معاشرہ جہاں معاشی اور سماجی برابری نہ تھی، کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا، خود فرد کی اپنی شناخت نہ تھی، وہیں ناصؔر کاظمی ماضی کی حسین یادوں کے سہارے اپنے غم کا مداوا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے

پھر کاگا بولا گھر کے سونے آنگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے

لہٰذا ناصؔر کاظمی اپنے سماجی و تہذیبی شعور کی بنا پر زندگی کی ہر تبدیلی کے بارے میں کھل کر اظہار کرتے ہیں ۔

مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دور صبح گاہی

انصاف کا دن قریب تر ہے
پھر داد طلب ہے بے گناہی

انھوں نے اپنے عہد کے انتشار اور ابتری کا بیان ایسے اسلوب میں کیا ہے جو بے حد دھیما اور نرم و نازک ہے۔ ناصؔر کاظمی اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کے کلام سے کیا جا سکتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے

ہم نے دیکھے ہیں وہ سناٹے
جب ہر اک سانس صدا ہوتی ہے

ناصؔر کاظمی کی شاعری نئے حالات یا نئے سماجی حالات کی عکاس ہے۔
ناصؔر کاظمی کھرے اور سچے شاعر تھے۔ انھوں نے ملک کی تہذیبی اور سماجی حالات کی تصویر اپنی شاعری میں پیش کی ہے۔ ناصؔر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے سماجی حقائق پر بھی نظر رکھنی چاہیے کیوں کہ ایسے حوصلہ شکن حالات ہونے کے باوجود وہ پُر امید نظر آتے ہیں اور ان کا خیال ہے۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصؔر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

ناصؔر کاظمی کی شاعری پر گفتگو کرنے سے پہلے کیوں نہ ان ادبی تحریکات پر ایک نظر ڈالتے چلیں جن سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ اس دور کی اہم تحریکات میں حلقۂ ارباب ذوق کی تحریک، ادب اسلامی کی تحریک، پاکستانی ادب کی تحریک اور ارضی وثقافتی تحریک کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں ان کے دور کی شاعری میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔
ناصؔر کاظمی کا دور بہت کرب ناک تھا کیوں کہ اس دور میں سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ ادبی انتشار بھی موجود تھا یعنی ایک طرف حکومت کی صعوبتیں شعرا کے دل ودماغ پر اثر انداز تھیں تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کا ادبی اختلاف بھی موجود تھا۔ اسی لیے جہاں شاعر کو یہ ملال ہے۔

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اگتے تھے جن میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

وہیں یہ بھی کہتے ہیں۔

میری نوائیں الگ، میری صدائیں الگ
میرے لیے آشیاں سب سے جدا چاہیے

ناصؔر کاظمی کے ادبی ماحول کو سمجھنے میں ان کی شعراوادیبوں سے ملاقاتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی پہلی ملاقات ۱۹۵۳ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں فیض احمد فیضؔ سے ہوئی۔ اس کے بعد ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ فیضؔ نے ان کو روزنامہ ''امروز'' میں ایک معقول جگہ پیش کی تھی مگر ناصؔر نے اس کو قبول نہیں کیا کیوں کہ وہ اخبارنویس بننا نہیں چاہتے تھے۔

اس کے بعد ناصؔر کاظمی کی ملاقات احمد ندیم قاسمی سے ۱۹۵۳ء ہی میں ہوئی جس وقت ناصؔر کی عمر ۲۴ سال تھی۔ ان کی یہ ملاقات دفتر انقلاب میں ہوئی تھی۔ جب احمد ندیم قاسمی ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کے مدیر ہوئے تو روزانہ شام کو دارالاشاعت پنجاب میں جہاں وہ قیام پذیر تھے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔

ناصؔر کاظمی کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی بھی اختر شیرانی کے بہت مداح تھے لہٰذا اکثر و بیشتر ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ جس سے ان کے ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ ادبی ماحول کا پتہ چلتا ہے۔

ناصؔر کاظمی کے دوست، شعروادب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے جورات کو، چائینز میں اکٹھا ہوکر کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد شعروشاعری کا ایسا دور چلاتے تھے کہ وہ صبح تک چلتا ہی رہتا تھا۔ ان کے دوستوں میں صوفی تبسم، عبدالمجید، حفیظ ہوشیارپوری، محمد صفدر، مبشر محمد بھٹی، پروفیسر کرامت حسین، شاہ صاحب، ابراہیم سلیم اور تقی الدین پال وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

زندگی کے حالات اور شخصیت

ناصر کاظمی کا اصلی نام ناصر رضا ہے آپ ۸ / دسمبر بہ روز ہفتہ ۱۹۲۵ء کی علی الصبح اپنے نانا مرحوم کے گھر محلہ قاضی واڑہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے موقع پر آپ کی والدہ کی کچھ سہیلیاں جن میں مس ڈیوس، مسز اسکاٹلر، مس زہرا، مس میری اور دیگر مبارک باد دینے کے لیے آئیں۔ ناصر کاظمی ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

ناصر کاظمی کے حالاتِ زندگی کے تعلق سے ان کی خالہ صغرا بی بی لکھتی ہیں:

''ناصر رضا آٹھ دسمبر ۱۹۲۵ء کو انبالے میں پیدا ہوا۔
اپنی ماں کا پہلا بچہ اور نانا دادا کے گھر کا چراغ تھا۔ میں
اس وقت لیڈی میکلگیلن اسکول میں برائے تعلیم داخل
تھی میں صرف دو روز یعنی ہفتہ، اتوار چھٹی پر آتی تھی،
صرف ناصر کو دیکھنے کی غرض سے۔۔۔ ابھی ناصر نے

بی۔اے کی ڈگری نہیں لی تھی کہ پاکستان بن گیا۔ ناصر
گرمیوں کی چھٹیوں میں (لاہور سے جہاں اس کی تعلیم
جاری تھی) جب انبالہ گیا تو کہنے لگا کہ ابا جان مکان
فروخت کر دیں اور لاہور میں کوٹھی بنوالیں یا کوئی مکان
خرید لیں، کیوں کہ بہت لوگ ہندو سکھ مکان فروخت
کر کے ہندوستان جا رہے ہیں، خدا جانے کیا وقت
آ جائے اور ہمیں لاہور جانا پڑے۔۔۔ ناصر کے والد
یہ سن کر بہت خفا ہوئے، بولے باپ دادا کی قبریں تھوڑا
ہی چھوڑ سکتے ہیں۔ ناصر نے کہا آپ یہاں سے ایسے
نکلیں گے کہ اپنا حقہ تک نہیں اٹھا سکیں گے آخر وہی ہوا
جو ہونا تھا، ایک دو بستر اور بکسوں کے سوا کچھ نہ
لا سکے۔"[۶]

ناصر کاظمی کے دادا سید شریف الحسن پولیس انسپکٹر کے ساتھ ساتھ نصیر پورہ، مگر پورہ اور راج گڑھ کے بہت بڑے زمین دار تھے۔ آپ کا شمار انبالہ کے چند نامور رئیسوں میں ہوتا تھا آپ کو گھوڑوں اور کتوں کے علاوہ دوسرے جانور پالنے کا بے حد شوق تھا۔ یہی شوق آگے چل کر ناصر کاظمی کی فطرت میں رچ بس گیا۔

ناصر کاظمی کی نانی کا اسم گرامی امیر بی بی بنت سید جعفر علی تھا۔ ان کے ۱۷ بچے سنِ صغیر ہی میں اس جہاں سے رخصت ہو گئے اور ناصر کی والدہ آخری بیٹی تھیں۔ امیر بی بی اپنی زندگی کے آخری اٹھارہ سال نابینا رہیں۔ ناصر کاظمی کی پرورش میں آپ کا بہت ہاتھ تھا، آپ ہی نے ناصر کاظمی کو پالا، پوسا اور بڑا کیا۔ آپ ۸۰ برس کی عمر تک بہت ہی چاق

وچوبند تھیں، چرخا کاتتیں، چکی پیستیں، کاغذوں کی ٹوکریاں بناتیں وغیرہ وغیرہ، انہیں ٹکڑوں کا حلوہ، آٹے کی سویاں، بیسن کی روٹی، سرسوں کا ساگ، رس اور بنولوں کی کھیر خاصی پسند تھیں۔ بچپن میں جب کبھی ناصرؔ کاظمی بیمار ہو جاتے تو وہ طرح طرح کے ٹونے کرتیں۔ غرض ناصرؔ کے نانا اور نانی ناصرؔ کاظمی سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی نانی نے اپنے والد اور خسر کے ساتھ مرزا غالبؔ سے ملاقات بھی کی تھی، جس سے ان کے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

یہی وہ وجہ ہے جس کی وجہ سے ناصرؔ کو اپنا ماضی بے حد عزیز تھا۔ ایسی چاہنے والی ہستیاں ناصرؔ کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں تھیں یہ وہ دور ہے جو ان کی شاعری میں روپ بدل بدل کر آتا ہے۔

ناصرؔ کاظمی کے والد کا نام سید محمد سلطان بن شریف الحسن تھا۔ آپ نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی اور اسلامیہ کالج لاہور میں نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز رہے اور اس کے ساتھ ساتھ سب انسپکٹر پولیس بھی ہوئے چوں کہ ان کا دل ملازمت کی طرف سے اچاٹ ہو گیا تھا اس لیے اس کو خیر باد کہا اور گھوڑ سواری کا شوق ہونے کی بنا پر پچیس سال کی عمر میں محکمہ سپلائی فوج میں ملازم ہوئے۔ اس سلسلے میں ترکی، بلوچستان، عراق، عرب اور مصر کا سفر بھی کیا۔ سید محمد سلطان جنرل ٹائسن کے دفتر میں صوبہ دار میجر بھی رہے۔ ناصرؔ کے والد نمازی، پرہیز گار، عابد شب گزار مخلص اور ایمان دار انسان تھے جن کے تعلق سے ناصرؔ کاظمی لکھتے ہیں:

''ایسے لوگ دنیا میں بہت نایاب ہیں۔''[۷]

ناصرؔ کاظمی کے والد جگر اور معدے کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ ۲۹/مئی ۱۹۴۹ء کی صبح سر گنگا رام دواخانے میں اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے۔ اُن کے والد انتقال کے وقت

ناصر سے کہہ رہے تھے:

''ناصر میرا نام زندہ رکھے گا اور اردو ادب اس پر ناز کرے گا۔''[8]

ناصر کاظمی کے والد کی یہ دور اندیشی بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ آج اردو ادب واقعی ناصر کاظمی پر ناز کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔

ناصر کاظمی کی والدہ کنیزہ محمدی شہر انبالہ مشن گرلز اسکول میں معلّمہ تھیں۔ وہ میر تقی میر، میر انیس اور میر حسن کی مدّاح تھیں۔ یہ بہت معصوم، نیک سیرت، نمازی، پرہیزگار اور رحم دل عورت تھیں۔ یہ دماغی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ۲۶/ ستمبر ۱۹۴۹ء کی صبح انتقال کر گئیں۔

ناصر کاظمی کے بڑے بھائی کا نام حامد حسین ہے جو محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ یہ ناصر کی پہلی والدہ سے تھے۔ ان کے علاوہ ان کی ایک بہن حمیدہ بانو بھی تھی جن کا انتقال اٹھارہ سال کی عمر میں قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے ہوا۔ ان کے تعلق سے ناصر لکھتے ہیں:

''۔۔۔وہ مجھے ماں سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔''[9]

ناصر کاظمی کے چھوٹے بھائی کا نام عنصر رضا ہے جو ان کی زندگی کا واحد سہارا تھے۔

ناصر کاظمی کی بیگم کا نام شفیقہ بانو ہے جو بہت ہی نیک دل عورت تھیں۔ ان سے ناصر کی شادی ۶/ جولائی ۱۹۵۲ء کو منٹگمری میں ہوئی۔ ناصر کی برات میں حلقۂ اربابِ ذوق اور کافی ہاؤس کے دوست واحباب شامل تھے جن میں قابلِ ذکر انتظار حسین، نور عالم، شیخ صلاح الدین، شاہد حمید، صفدر میر، خواجہ اسد اللہ، نانا فضل رسول، حفیظ بھائی

حامد، اصغر حسین، شاکر، عنصر اور بھابی وغیرہ ہیں۔

ع شاعر شہر طرب شاداں شدہ [10]

ع عید شاعر شہر طرب [11]

ناصرؔ کاظمی کے بڑے بیٹے کا نام سید باصر سلطان (گڈو) ہے جو ۴/ اگست ۱۹۵۳ء کو منٹگمری میں پیدا ہوئے۔ ان کے دوسرے بیٹے کا نام سید حسن رضا سلطان ہے جو یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو منٹگمری ہی میں پیدا ہوئے۔ ناصرؔ کاظمی اپنے دونوں صاحب زادوں سے بہت پیار کرتے تھے اور وہ اللہ سے یہ دعا کرتے تھے کہ ان کے دونوں بیٹے ان کے سامنے جوان ہوں اور پھلے پھولیں۔ ناصرؔ کو اپنی بیوی سے بھی بے حد پیار تھا جب کبھی وہ بچوں کے ساتھ منٹگمری چلی جاتیں تو ناصرؔ بے حد اداس ہو جاتے اور وہ بھی لاہور سے منٹگمری روانہ ہو جاتے۔ اسی کیفیت میں ناصرؔ نے یہ شعر کہا ہوگا۔

جانے کی اس کے شہر سے جلدی بھی تھی مگر

اس شہر سے چلے تو ہوا دل اداس بھی

ناصرؔ کاظمی نے ابتدائی تعلیم نیشنل ہائی اسکول پشاور سے حاصل کی۔ پھر انھوں نے مشن گرلز اسکول میں پانچویں جماعت تک تعلیم پائی اور اس کے بعد کی تعلیم والدہ مرحومہ کے زیر سایہ حاصل کی۔ ناصرؔ کاظمی نے بارہ برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا اور تیرہ برس کی عمر میں گلستان، بوستان، شاہ نامہ فردوسی، قصہ چہار درویش، فسانۂ آزاد، الف لیلیٰ، صرف ونحو اور دیگر شاعری کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے ساتویں اور آٹھویں جماعت ڈی۔ بی۔ مڈل اسکول ڈکشائی سے کامیاب کیا۔ سپاٹو میں ناصرؔ نے ورنے کلر فائنل مڈل اسکول کا امتحان دیا اور ضلع شملہ میں اوّل رہے اور وظیفہ حاصل کیا۔ نویں اور دسویں جماعت کی تعلیم مسلم ہائی اسکول انبالہ سے حاصل کی اور امتحان میں امتیازی

نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ایف۔اے کا امتحان کامیاب کیا۔ ناصؔر کاظمی کو پڑھائی کا بے حد شوق تھا مگر مختلف وجوہات کی بنا پر انھوں نے بی۔اے کی تعلیم مکمل نہیں کی تعلیم کے شوق نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا لہٰذا انھوں نے ۲۷ سال کی عمر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں دوبارہ داخلہ لیا مگر ان کے داخلے میں ان کی عمر اور عرصہ حائل ہو رہا تھا لیکن جیسے تیسے کر کے ان کو داخلہ مل گیا اور وہ تیسرے سال میں داخل ہو گئے۔ ان کے منتخبہ مضامین فارسی، فلسفہ اور انگریزی تھے۔ ناصؔر داخلہ ملنے کی کیفیت کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں:

> ''آج میرا دل ایک بار پھر خوشی اور ناتمام کسک پوری کر رہا ہے۔''[۱۲]

ناصؔر کاظمی کو جدید علوم و فنون سے بے حد دلچسپی تھی اور وہ انجینئر یا سائنس داں بننا چاہتے تھے۔ ان کو ایر فورس کے فن سے بہت دلچسپی تھی اور وہ Pilot بننا چاہتے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ پائلٹ کیوں نہ بنے؟ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جو کام جہاز کے پائلٹ کر سکتے ہیں وہ شاعر نہیں کر سکتے۔ جنگ میں تیز رفتاری جیت کی راہ ہموار کرتی ہے۔ جب کہ شاعری تیز رفتار نہیں ہوتی بلکہ آہستہ آہستہ اثر کرتی ہے لیکن اس کے نتائج دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔

ناصؔر کاظمی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی مکمل شخصیت ان کی شاعری کی ساحرانہ کیفیات میں ڈوبی ہوئی ہے جس کے تعلق سے وہ خود لکھتے ہیں:

> ''میری باتیں سچی، کھری، خوب صورت اور رنگ و آواز کا ایک مجموعہ ہوتی ہیں، لوگ کیوں نہ سنیں۔ میں پچھلی رات کا ایک جادو ہوں۔ چڑھتے سورج کی دنیا

کو اپنے لفظوں سے مسحور کرتا ہوں۔''[۱۳]

ناصؔر کاظمی کو فطرت سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کی گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت ہمارے دلوں پر دستک دے رہی ہو۔ ناصؔر کاظمی اپنے اندر مکمل جہان آباد کر رکھے تھے۔ ان کو جھرنے، پھول، چڑیوں وغیرہ سے ملاقات کے لیے کہیں جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی وہ یہ سب کچھ اپنے چشم تخیل سے دیکھ لیتے تھے۔[۱۴]

ناصؔر کاظمی کے مزاج کا بنیادی وصف واقعیت اور حقیقت پسندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری صرف عشق کے معاملات ہی تک محدود نہ رہی بلکہ وہ زندگی کی عام حقیقتوں کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔

ناصؔر کاظمی کی شخصیت کا خاص وصف ان کی سادگی تھا، صفائی ان کی جان اور خلوص اور صداقت ان کا جوہر۔ برجستگی اور بے ساختگی، شگفتگی اور شادابی، توازن اور ہم آہنگی، ان کی شخصیت کے خاص پہلو ہیں۔ فراق نے ان کی موت پر ایک مختصر مضمون میں ناصؔر سے لاہور کی ایک ملاقات کو یاد کرتے ہوئے لکھا:

> ''مجھ کو ناصؔر کاظمی سے پہلی ہی ملاقات میں روحانی قرب حاصل ہو گیا تھا۔ ایک سچے، شریف اور پُر خلوص ادیب اور شاعر کی شخصیت، ناصؔر کاظمی کی شخصیت تھی۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے متعدد صحبتوں میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے، پیش پیش رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی سے میری نظر خاص طور سے ان پر پڑی۔''[۱۵]

ناصؔر کاظمی نے متعدد شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا تھا لہٰذا اگر ناصؔر اچانک کسی

شاعر کا ایسا کلام سنا دیتے جس کی معنویت بے حد بلیغ ہونے کے باوصف کلام ایسا ہوتا جسے پہلے کسی نے نہ سنا ہو، تب دوست واحباب داد دیتے تو ان کے چہرے پر انوکھی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

ناصؔر کاظمی انوکھی شخصیت کے ساتھ ساتھ مضطرب اور متجس شخصیت کے حامل تھے۔

ناصؔر کاظمی کی شاعری اور شخصیت کا خصوصی وصف برجستگی ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ناصؔر جب شعر کہتے ہیں تو کہیں سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اپنی طبیعت پر دباؤ ڈال رہے ہوں۔ بلکہ ان کے اشعار خودرو پودوں کی طرح اگتے ہیں۔ یہ برجستگی شاعر کے غیر معمولی رچاؤ اور انہماک کو ظاہر کرتی ہے۔

ناصؔر کاظمی کے یہاں جو بے ساختگی پائی جاتی ہے اس کا بنیادی راز یہ ہے کہ وہ مجرد خیالات سے دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ ٹھوس اشیا سے دلچسپی رکھتے ہیں دراصل تخلیق کے دوران میں ناصؔر نہ صرف سوچنے پر انحصار کرتے ہیں بلکہ مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور قاری کو مکمل اور متحرک نمونوں کا مشاہدہ بھی کراتے ہیں۔

کڑے کوسوں کے سناٹے ہیں لیکن
تری آواز اب تک آ رہی ہے

مرا تو خوں ہوگیا ہے پانی، ستم گروں کی پلک نہ جھپکی
جو نالہ اٹھا تھا رات دل سے نہ جانے کیوں بے اثر ہوگیا وہ

ناصؔر کاظمی کا انداز گفتگو بے حد نرالا تھا۔ ان کے جملے بے حد پُر لطف ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جوشؔ کی شاعری کے سلسلے میں ناصؔر کاظمی کا یہ جملہ بڑا مزے دار ہے جو بہت مقبول ہوا تھا:

''وہ ہاتھی پر بیٹھ کر شکار کھیلنے نکلتے ہیں مگر چڑیا مار کر لاتے ہیں۔''[16]

ناصر کا مقصد جوش کی تحقیر کرنا نہ تھا بلکہ وہ گفتگو میں مزا پیدا کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

ناصر کاظمی میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ کبھی احساس کمتری کے شکار نہ ہوئے بلکہ ان کے یہاں اعتماد سے بھرپور با مقصد آواز موجود ہے۔ ناصر نے ہمیشہ دل کی روشنی کو اپنا ہم راز بنایا، وہ کبھی راہ سے بھٹکے نہیں۔ اس کا اندازہ ان کی شاعری سے لگایا جا سکتا ہے۔

ناصر کاظمی ہمیشہ حقیقت پسند، عملی، دنیاوی اور تخیلی و تخلیقی معاملات میں نہایت باہمت نظر آتے ہیں وہ اپنے دوست واحباب پر مکمل بھروسہ کرتے تھے جس سے ان کی دور بینی اور فہم کی اپج کا پتہ چلتا ہے۔

ناصر کاظمی مردم شناس تھے، ان کو دھوکہ دینا محال تھا۔ ناصر کاظمی بہ ظاہر ایک کھلے شہر کی طرح بے داغ نظر آتے تھے مگر اس کے کسی دشمن کو بھی حملہ کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی ان کو یہی احساس ہوتا تھا کہ وہ ہتھیاروں سے لیس ہیں جس کسی نے بھی ان کو کمزور جان کر حملہ کیا اس نے ہمیشہ منہ کی کھائی ہے۔[17]

بہ حیثیت انسان اور بہ حیثیت شاعر ناصر کبھی مایوس اور نا امید نہیں ہوئے تھے بلکہ ہر کام کو پوری دلجمعی کے ساتھ کرتے تھے۔ پہلا کام ختم کرنے کے بعد دوسرے کی طرف توجہ کرتے تھے۔

ناصر کاظمی محبت کرنا ہی نہیں بلکہ کرانا بھی جانتے تھے۔ یہ دوسروں سے محبت، بغیر کسی توقع کے کرتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ ناصر کو اپنی بیگم، بچوں

اور دوست واحباب کے علاوہ ہر سچے انسان سے محبت تھی۔[18]

ناصر کاظمی ہر ایک سے سچ کہنے کے بالکل قائل نہ تھے۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ سچ بولنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے یا ان کو سچ کی پہچان نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ وہ سچ کو بہت بڑی نعمت گردانتے تھے اور ہر شخص کو اس کا حق دار نہ سمجھتے تھے۔ وہ سچ صرف ایسے دوستوں سے کہا کرتے تھے جو اکثر و بیشتر صرف سچ ہی بولتے ہیں۔ ناصر دوستوں کے علاوہ ایسے اشخاص سے بھی سچ کہنا ضروری سمجھتے ہیں جو حق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور حق تک پہنچ جاتے ہیں۔[19]

ناصر کاظمی بچپن سے بڑے ضدی تھے اور عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی ضد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ کبھی اپنی ضد کو دبانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے چاہنے والے ہمیشہ ان کی ضدیں پوری کرتے تھے مگر یہ ضد آگے چل کر ناصر کے لیے پریشانی کا باعث بنی کیوں کہ ان کو چاہنے والی ہستیاں ان کو تنہا چھوڑ کر چلی گئیں تھیں۔[20]

ناصر کاظمی کو غصہ بہت کم آتا تھا مگر جب غصہ آتا تو ایک طوفان کی طرح آتا تاہم غصہ میں کہی گئی باتیں بہت ہی واضح اور مربوط ہوتی تھیں۔ ناصر کاظمی کو ہمیشہ یہ یقین رہتا تھا کہ ان کا غصہ صحیح بات، صحیح شخص اور صحیح وقت کے ساتھ ساتھ صحیح آدمی پر ہے۔[21] ہوا یوں کہ ایک دفعہ ناصر نے اپنا ایک مصرعہ ع:

ہر آواز پر میر غالب رہا

ڈاکٹر سید عبداللہ کو غالب کے نام سے سنایا تو انھوں نے کہا کہ یہ مصرعہ دیوان میں نہیں ہے۔ ناصر نے نسخۂ حمیدیہ کا حوالہ دیا وہ مان گئے بعد میں ناصر کاظمی کی نظم ''نیا شہر'' شائع ہوئی جو عبداللہ کی نظروں سے بھی گزری وہ پڑھ کر شل ہو گئے اور ناصر کے گھر پر آ کر ان پر بگڑنے لگے کہ تم نے جھوٹ کیوں کہا۔ ناصر نے کہا! اگر میں جھوٹ نہ بولتا تو اتنی بڑی داد

کیسے ملتی۔ یعنی کہ خود ناصر کا مصرعہ غالب کے نام سے سنایا تو واہ واہ۔ لیکن اگر خود کہو تو! ہاں اچھا ہے وغیرہ۔ چناں چہ ناصر کاظمی کو ایسے بت پرست لوگوں سے سخت چڑ تھی۔ ۲۲

ناصر کاظمی وقت کی قدر کرنا جانتے تھے۔ ان کو بچپن میں گھڑی سے بہت چڑ تھی کیوں کہ یہ ان کی عادت تھی کہ وہ ہر روز صبح نیند سے بیدار ہو کر کچھ وقت کبوتروں کے ساتھ گزارا کرتے تھے مگر جیسے ہی وہ کبوتروں کو آزاد کرتے یا جب وہ کبوتر آسمان میں اڑنے لگتے تو نیچے سے ان کے والد ان کو آواز دیا کرتے کہ بیٹے ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں نیچے آ جاؤ اسکول کا وقت ہو رہا ہے لہذا یہ گھڑی ان کے اور کبوتروں کے درمیان حائل ہو رہی تھی مگر جیسے جیسے وہ عمر کی دہلیز پر آگے بڑھتے گئے ان کو وقت کی قدر ہونے لگی اور انھوں نے گھڑی کو وقت کی علامت قرار دیا کیوں کہ انسان وقت کی قید سے اگر آزاد ہونا چاہے تو بھی آزاد نہیں ہو سکتا اس کی شخصیت اسے معاشرے میں رہنے کے لیے پابند کر دیتی ہے۔ ۲۳

ناصر کاظمی اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھوڑ سواری، شکار کھیلنے، دیہات میں پھرنے اور دریاؤں اور پہاڑوں کی سیر کرنے میں کافی دلچسپی رکھتے تھے لہذا یہیں سے ان کے ذہن نے ''فطرت سے محبت اور شاعری سے لگاؤ کے لیے نشوونما پائی۔'' ۲۴

ناصر کاظمی کو موسیقی سے خاص رغبت تھی انھوں نے استاد عبدالعزیز سے ستار اور سارنگی سیکھنے کی کوشش کی لیکن کالج کھلنے پر دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی اور اسی اثناء میں ان کے استاد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے باوجود کچھ عرصہ انھوں نے ستار سے شوق کیا مگر جب ان کو یقین ہو گیا کہ وہ موسیقی میں کچھ نہیں کر سکیں گے اور اُردو شاعری میں بہت کچھ کر سکتے ہیں تو انھوں نے اپنے آپ کو موسیقی کے سلسلے میں سننے تک ہی محدود رکھا اور شعر و تخلیق کا رشتہ استوار کیا۔ ناصر کاظمی کو کلاسیکی گانوں کے علاوہ بنگالی گانوں کی دھنیں

بھی بہت پسند تھیں جن میں یہ دھن قابلِ ذکر ہے۔ ۲۵؎ ع

گورا ندی کے گھاٹ پر

ناصؔر کاظمی استاد اسد علی خاں کے علاوہ، کدارا، جے۔ جے۔ ونتی، تلک کامو، دیتان وٹھمری اور میگھ ملہار سنا کرتے تھے۔ اپنے دوست واحباب کے ساتھ اکثر ان کی موسیقی کی محفلیں سجا کرتی تھیں اور موسیقی پر گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ ۲۶؎

ناصؔر کاظمی نے موسیقی کے علاوہ مصوری سے بھی عشق کیا اور اس فن کی مشق کے دوران میں اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ ان کا میدان نہیں ہے بلکہ شعروشاعری ہی ان کا اصل میدان ہے۔ لہٰذا انھوں نے شاعری کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مصوّروں سے دوستی بھی کی اور ان سے مصوری کے تعلق سے خوب باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ ۲۷؎ ناصؔر اکثر مصوری کی نمائشوں میں جایا کرتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے کئی ایک مصوّروں کی نمائشیں دیکھیں جن میں مغل مصوری کے نایاب شاہکار، پال سیزن کی تصاویر، احمد پرویز کی تصویروں کی نمائش وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے شاگال اور ماتیس پر باقاعدہ مضامین بھی لکھے۔ پاکستان میں جدید مصوری کے سالار شاکر علی سے ناصر کی دوستی کا پتہ چلتا ہے جس کا ذکر ناصؔر کاظمی کے اکثر سوانح نگاروں نے کیا ہے۔ لہٰذا اس بات سے ناصؔر کاظمی کو مصوری سے عشق کا پتہ چلتا ہے۔ موسیقی اور مصوری کے رموز پر ان کی گرفت مضبوط ہونے کی وجہ سے وہ اپنے معاصر غزل گویوں میں منفرد و مقبول ہوئے۔

کیا قیامت ہے کہ بے ایام گل
ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہوگئے

شام ہوئی اب گلیوں میں
دیکھو چلتے پھرتے پھول

کچی عمر میں کچے رنگ
ہنس مکھ بھولے بھالے پھول

دھیان میں پھرتے ہیں ناصرؔ
اچھی آنکھوں والے پھول

ناصرؔ کاظمی کو گھوڑسواری کا بے حد شوق تھا انھوں نے ضلع انبالہ اور پٹیالہ کے تقریباً ۱۵۰ گاؤں اور پنجاب کے بیشتر گاؤں کا سفر گھوڑے پر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے شملہ ہلز، ڈکشائی، جتوک، کوٹ گڑھ، کسولی سپاٹو، کمارہٹی، دھرم پورہ، ڈیرہ ڈون، مسوری، مری، ڈلہوزی، ایبٹ آباد اور کشمیر کی سیر کی۔[۲۸]

ناصرؔ کاظمی کو گھوڑسواری کے ساتھ ساتھ شکار کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے اپنے دوست چودھری انوار احمد کے ساتھ ضلع انبالہ کے تقریباً تمام دیہاتوں کا سفر کیا اور ان ہی کے ساتھ تقریباً دو تین برس تک ہرن کا شکار کیا اور گھوڑسواری بھی کی اور ان ہی کے ہمراہ شکار کے دوران تیس چالیس کوس گھوڑے پر سفر کرنا ان کا معمول تھا۔[۲۹]

ناصرؔ کاظمی کو فوٹوگرافی کا بھی شوق تھا وہ اکثر و بیشتر اپنی تصاویر اپنے دوست و احباب اور بیگم اور بچوں کے ہمراہ کھینچواتے تھے۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ مشاعرے میں شرکت کے لیے جاتے تو نہ صرف اپنی بلکہ دوسرے شعرا کی بھی تصاویر لیتے تھے۔ ناصرؔ کاظمی نے اپنے دوست و احباب کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس کے سامنے کئی ایک تصویریں کھینچوائی ہیں۔[۳۰]

ناصر کاظمی کو فلم بینی کا بھی شوق تھا وہ انگریزی فلمیں کثرت سے دیکھا کرتے تھے۔ ناصر کاظمی اپنے دوستوں اور اپنی بیگم کے ہمراہ فلمیں دیکھا کرتے تھے انھوں نے کئی ایک فلموں کے ساتھ کئی ایک شو بھی دیکھے ہیں جن میں سے یہ چند قابلِ ذکر ہیں:

"King Soloman's Mines, Bitter Rice, Sunset, Tarana, Tarzen's Fury, Desert Hawk Out Law, Without Target, Fast of Bornes, Golden Hawk, On Wendes, سندھ باد Storm Over Tiber, نپولین کی محبوبہ، جہازی، Bullfighter & The Lady, سکندراعظم، Loves of Carmen, Elephant Walk, Egyptian Dance, The Brave One, Bull-boy etc." ۳۱

ناصر کاظمی کا پسندیدہ اداکار ٹارزن ہے۔ وہ ٹارزن کی ایک بھی فلم دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اُن کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اس کردار کی فلم تنہا ہی دیکھنا پسند کرتے تھے، اس میں وہ کسی کو شریک کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حالاں کہ دوسری فلمیں وہ کبھی تنہا نہیں دیکھا کرتے تھے۔ ۳۲

ناصر کاظمی کو مختلف کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ کرکٹ کے شوقین تھے۔ ناصر کاظمی ہند۔ پاک کرکٹ میچ کے مقابلے بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کو شطرنج کے کھیل سے بھی دلچسپی تھی اور وہ یہ کھیل اکثر کھیلا کرتے تھے وہ شطرنج کے اچھے کھلاڑی

تھے جس سے ان کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ ۳۳ے

ناصؔر کاظمی کو بچپن سے کبوتر پالنے کا بہت شوق رہا ہے اور ان کے تعلق سے وہ غیر معمولی معلومات رکھتے تھے۔ شہر انبالہ میں ناصؔر کے کبوتروں کی زیارت کے لیے دور دور سے رئیس آتے اور خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کے والد، والدہ اور نانی ناصؔر کے کبوتروں کا خاص خیال رکھتے تھے حالاں کہ ان کی نانی نابینا تھیں مگر ناصؔر کے کبوتر اور بلّی ان سے بہت مانوس تھے۔ طلوع آفتاب کے وقت جب ناصؔر کاظمی کے کبوتر آسمان کی سیر کر رہے ہوتے تو شہر بھر میں خاصی دھوم مچ جاتی۔ ان کبوتروں کی نسلیں اب ہمارے ملک میں نایاب ہیں۔ ہجرت کے وقت ناصؔر کو اپنے کبوتروں سے ہاتھ دھونا پڑا اور انھوں نے ۲۱/ اگست کو اپنے تمام کبوتر باوا سنت سنگھ رئیس انبالہ کے حوالے کر دیے۔ ۳۴ے تاہم پاکستان جا کر وہ اپنے کبوتروں کو بہت یاد کرتے تھے۔

ناصؔر کاظمی کے یہاں جو کبوتر پائے جاتے تھے وہ مختلف اقسام کے تھے جن میں سے چند ایک قابل ذکر ہیں۔ رنگین، کپور، شیرازی، خال، جوگیے، مینا زاغ، قمریا، پوٹی، خال گلدار، شیرازی گلدار، چپ گلدار، خال چپ شیرازی چپ، چوا چندن، محولا، زرد، تانبڑے، بھاتیے، بہروپیے، یاہو، چوٹی دار وغیرہ۔ ان تمام کبوتروں کا رنگ زرد، لال، کتھئی، سبز، اگرئی، کالے، بیگنی، سفید، کپور، دوباز ہوتا ہے۔ ۳۵ے

ناصؔر کاظمی کو بچپن میں ریل گاڑی کے ساتھ دوڑنے کا بھی شوق تھا۔ ناصؔر کے نانا ہر روز شام کے پانچ بجے چائے کے بعد ناصؔر کو ریل گاڑی دکھانے لے جاتے تھے۔ جو ناصؔر کے گھر کے عقب میں ایک کھیت کے قریب سے گزرتی تھی۔ ناصؔر اس ریل گاڑی کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتے اور اس کے ساتھ دوڑنے کی کوشش کرتے لیکن ان کے نانا ان کو بہلا پھسلا کر گھر لے جاتے۔ ۳۶ے

ناصؔر کاظمی کو ہر موسم پسند تھا ان کو نہ گرمی سے پریشانی ہوتی تھی اور نہ سردی سے بے قراری نہ بہار سے عشق تھا نہ خزاں سے نفرت۔ وہ ہر موسم کے حسن سے واقف تھے اور ان سے لطف اندوز ہونا بھی جانتے تھے۔ ناصؔر کاظمی اکثر تپتی دوپہروں کو سڑکوں پر گھوما کرتے تھے اور سردیوں کی راتوں میں اس کا مزہ لینے سڑکوں پر نکل آتے تھے اور خاموشی سے مزا لیتے۔ بہار کے موسم میں وہ متعدد باغوں کی سیر کو جاتے اور وہاں کا نظارہ کرتے تھے غرض ان کو کسی بھی موسم سے کوئی شکایت اور تکلیف نہ تھی۔ ۳۷؎

ناصؔر کاظمی خوش خوراکی و خوش لباسی کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ کھانے میں مرغ، پرند کا گوشت، ہرن کی ران، تنور کا پراٹھا، انڈے، مکھن، دہی، ٹوسٹ وغیرہ اور پھلوں میں آم، انگور، سرکا، انار، آڑو، مالٹا بے حد پسند کرتے تھے۔ ناصؔر خوش خوراک ہونے کی بنا پر دال سے سخت نفرت کرتے تھے ایک دفعہ نوشہرہ میں انھوں نے دال کی ہنڈیا الٹ دی تو والدہ ان پر بہت ناراض ہوئیں۔ لیکن بعد میں ان کو انڈے کھلائے۔ ناصؔر کاظمی خاصے چٹورے تھے اگر وہ سفر پر کہیں جانے کے لیے نکلتے تو راستے میں ایک سے زائد کئی چیزیں خریدتے رہتے جن میں پھلوں کا رس، مولسری کے پھولوں جیسے پکوڑے، چائے، پان وغیرہ۔ ان کے دوست واحباب ان کے چٹورپن سے سخت خفا ہوتے تھے۔ ۳۸؎

ناصؔر کاظمی خوش لباسی کو بہت پسند کرتے تھے مگر بے روزگاری کی وجہ سے یہ انھیں میسر نہیں تھی لہٰذا ہر وقت وہ سیدھے سادے مگر پاک وصاف کپڑے زیب تن کیے رہتے تھے جن میں ریشمی اور بھورے رنگ کی شرٹ اور سرمئی پتلون قابل ذکر ہیں۔ ان کو سفید رنگ بے حد پسند تھا اور وہ اکثر اس رنگ کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ ۳۹؎

ناصؔر کاظمی کی نجی محفلیں اپنے دوست واحباب کے ساتھ سجتی تھیں۔ یہ محفلیں اکثر رات دیر گئے ہوٹل میٹرو یا چائنیز یا کسی باغ میں یا ناصؔر اور ان کے دوست واحباب کے

گھروں پر چلتی رہتی تھیں اُن محفلوں کے رازداروں میں انتظار حسین، شیخ صلاح الدین اور غالب احمد پیش پیش رہتے تھے۔ یہ لوگ بات چیت میں اس قدر محو ہو جاتے کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا تھا اور ہوٹل بند ہونے کا وقت ہو جاتا اس کے بعد یہ لوگ ریلوے اسٹیشنوں پر واقع چائے خانوں میں منتقل ہو جاتے۔ اس ضمن میں ملاحظہ کیجیے ناصؔر کی مشہور غزل جس کا مطلع یہ ہے۔ [40]

شام سے سوچ رہا ہوں ناصؔر

چاند کس شہر میں اترا ہوگا

ناصؔر کاظمی بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ ایک دن میں وہ کم و بیش ۳۷۔۰۷ سگریٹ پی لیا کرتے تھے۔ وہ سگریٹ کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ صبح بیدار ہونے کے بعد وہ دیا سلائی سے پہلا سگریٹ سلگاتے اور اس کے بعد دوسرا سگریٹ، پہلے سگریٹ سے سلگاتے رہتے۔ سوتے وقت بھی ان کے سرہانے سگریٹ اور دیا سلائی موجود ہوتی۔ جب ان کو کینسر کے مرض نے آ دبوچا تو ڈاکٹر نے پان اور سگریٹ کا استعمال کرنے سے منع کر دیا جس کی وجہ سے وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے یا زندہ رہنے سے انکار کر دیا۔ ناصؔر کاظمی کو سگریٹ کیپٹن اور گولڈ فلیک بہت پسند تھے۔ اس کے علاوہ وہ کریون اے اور دوسرے اچھے سگریٹ پینا بھی پسند کرتے تھے۔ ناصؔر کے دوست نور عالم نے سوبرانی سگریٹ کچھ عرصہ تک پلایا جس کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں: [41]

''پھیکا اور معصوم سگریٹ ہے''

ناصؔر کو سگریٹ کی طرح چائے کا بھی بے حد شوق تھا اور وہ دن میں کئی بار چائے پیا کرتے تھے۔

ناصؔر کاظمی پان کا استعمال بھی کثرت سے کیا کرتے تھے ان کو احمد آبادی پان کے

ساتھ ساتھ ہندوستانی پان پسند تھے۔ ان کو ہندوستانی پانوں میں لکھنو، دلی، بنارس، الہ آباد، پٹنہ، سہارنپور، انبالہ اور کلکتہ کے پان بے حد پسند تھے وہ اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''پان تھا یا چراغ۔۔۔واجد علی شاہ کا جگر گوٹہ، ہیرا جیسی الائچی، چاندنی جیسا کتھا، ستاروں جیسا چھالیہ، ریشم جیسا کتھا، پان کیا جیسے برگ پر تتلی بیٹھی ہوئی ہو، منہ میں جاتے ہوئے بتاشہ کی طرح گھل جائے۔۔۔'' ۴۲

ناصؔر کاظمی اور ان کے دیرینہ دوست صلاح الدین کے درمیان اکثر رات کو بحث و مباحثہ بڑے زور و شور سے جاری رہتا۔ ان مباحثوں کی نوعیت بہ قول ناصؔر ''خوں ریز'' قسم کی ہوتی۔ ان کے دوسرے دوست اکثر پریشان ہو جاتے کہ شاید ان دونوں کی دوستی ختم ہو جائے گی اور پھر کبھی وہ نہ ملیں گے مگر اگلے روز یہ پھر ملتے چائے پیتے اور بحث و مباحثہ میں محو ہو جاتے لہذا ان کے تمام دوست ان کی ''خوں ریز'' بحث و مباحثے کے عادی ہو گئے۔ ۴۳

ناصؔر کاظمی کو ٹیبل ٹاک پر خاصی مہارت حاصل تھی۔ ہر روز وہ کسی نہ کسی ہوٹل یا پھر میٹرو ہی میں میز کے گرد دوست واحباب کے ساتھ جمع ہو جاتے اور کسی نہ کسی موضوع پر بحث کرتے ناصؔر کی ٹیبل ٹاک نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ اس میں ان کے دیرینہ دوست انتظار حسین موجود رہتے تھے اور ناصؔر کی بحث میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح ''سوچ اور جذبات'' کے عنوان پر ان لوگوں کی بہت ہی معنی خیز گفتگو ہوتی تھی۔ ۴۴

ناصؔر کاظمی کو سیر کرنے کا بھی شوق تھا۔ پشاور میں وزیر باغ، شاہی باغ، قلعہ اکبر وغیرہ ان کی پسندیدہ سیر گاہیں تھیں۔ ناصؔر کاظمی نے پہاڑوں، دریاؤں اور باغوں کے علاوہ چڑیا گھر کی بھی سیر کی اور وہاں کے چرند، پرند، حیوانوں، جانوروں کے ساتھ دن

گزارا کرتے تھے۔[۴۵]

ناصر کاظمی دیہاتوں کے علاوہ بعض شہروں کا بھی سفر کیا کرتے تھے اور وہ شہر انبالہ سے بہت متاثر تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں انبالہ شہر کا باسی ہوں، وہاں میں پیدا ہوا، میری ماں پیدا ہوئیں، میرے نانا پیدا ہوئے۔ انبالہ اب ہندوستان مشرقی پنجاب میں ہے۔ انبالہ کے آم، دریا، ہرن، سرسوں کا ساگ، مکی، بیر، املی، طوطے، مور، کبوتر، صحرا، کھرنیاں وغیرہ۔۔۔ خلجیوں اور مغلوں کے زمانے سے لے کر آج تک شمالی ہندوستان کی سب سے بڑی اور مضبوط ترین چھاونی ہے۔''[۴۶]

شہر انبالہ کے تعلق سے ناصر کاظمی کے ایک سوانح نگار حسن رضوی کا کہنا ہے:

''۳۱/ستمبر ۱۹۴۷ء کو اپنے خاندان کے ساتھ ناصر کاظمی نے انبالہ کو خیر باد کہا اور لاہور میں جا بسے۔ اپنے ساتھ وہ اپنا خزانہ یاد بھی لے گئے۔''[۴۷]

اس کے علاوہ ناصر کاظمی نے اپنے دوست محبوب خزاں کے ہمراہ خیبر مل سے جہلم کا سفر کیا اور ڈاک بنگلہ ایم۔ ای۔ ایس میں قیام کیا۔ اس بنگلہ کی جادوئی فضا سے ناصر کاظمی بہت متاثر ہوئے اور چار پانچ روز اسی بنگلہ میں قیام کیا۔ اس سفر کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''یہ سفر میری زندگی کا ایک یادگار سفر ہے۔''[۴۸]

ناصر کاظمی کی پوری تخلیقی زندگی جستجو کے سفر سے عبارت ہے۔ ۱۹۴۷ء کے

فسادات، تقسیم اور ہجرت کے حادثہ نے انھیں ایک نئی شخصیت سے ہمکنار کیا۔ ہجرت کا یہ احساس ناصؔر کاظمی کو اداسی کی طرح عزیز ہے اور یہ اداسی انھیں عرفان بھی بخشتی ہے اور اس اداسی نے ان کے یہاں نئی زبان پائی ہے۔ ۴۹؎

دل تو میرا اداس ہے ناصؔر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصؔر کو اپنے وطن اور اپنے رشتہ داروں سے بچھڑنے کا بہت زیادہ دکھ تھا۔ یہی دکھ اور اداسی ناصؔر کی روح سے گزرتی ہوئی شعروں میں سرایت کر جاتی ہے ؎

دن بھی اداس اور مری رات بھی اداس
ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی

سلیم احمد لکھتے ہیں:

''ناصؔر کی آواز اپنے دور کی سب سے زیادہ دکھی اور اداس آواز ہے اور بعض اوقات ہمارے وجود کے سچے تاروں کو اس طرح چھوتی ہے کہ اس کی چوٹ دیر تک دل میں محسوس ہوتی رہتی ہے۔ ناصؔر کی اداسی کچی چاندنی کی طرح سچی اور خالص ہے۔'' ۵۰؎

ناصؔر کی اداسی کا باعث دراصل ان کا ماضی ہے۔ ایسی یادیں جن کو وہ مستقلاً اپنی آنکھوں میں چھپائے پھر رہے ہیں لہذا یہ اداسی ان کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے مگر یہ بے کلی انھیں بیزار نہیں کرتی بلکہ جینے کی وجہ بن جاتی ہے۔ ۵۱؎

یہ کہنا کہ ناصؔر کاظمی ہر وقت اداس رہتے ہیں سچ نہیں ہے کیوں کہ وہ خوش ہونا بھی اور خوش رہنا بھی جانتے ہیں۔ سرخ، نیلے، پیلے، سبز پھولوں کو دیکھ کر ناصؔر کاظمی بہت خوش

ہوتے ہیں۔

ناصر کاظمی تنہائی پسند انسان تھے جب کبھی وہ لوگوں کی بھیڑ میں موجود ہوتے تو ان کا ذہن کہیں اور سفر کر رہا ہوتا ہے یعنی کہ وہ ظاہری طور پر وہاں موجود رہتے مگر ذہنی طور پر کہیں اور موجود ہوتے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں:

> ''تانگوں کے چلنے کا شور اور بارش کی بوندوں کا ناچ میرے کمرے کے سکوت کو توڑ رہا ہے۔ موم کی تین شمعیں روشن ہیں جن کی روشنی میں یہ الفاظ تحریر کر رہا ہوں۔ مرجاؤں گا تو دنیا روئے گی۔۔۔ بیسویں صدی کا سچا، مخلص، منفرد شاعر۔۔۔ ناصر کاظمی رہتی دنیا تک حساس دلوں کو گرمائے گا۔۔۔ میں چاند میں سو رہا ہوں گا۔'' ۵۲؎

ناصر کاظمی کی خارجی زندگی کے تمام پہلوؤں سے ان کے دوست مکمل طور پر واقفیت نہیں رکھتے تھے بہ حیثیت انسان ان کی شخصیت میں کئی پہلو پنہاں تھے ناصر کاظمی زندگی بھر شدید گہرے جذبات اور کیفیات کے ساتھ عمر کے آخری پڑاؤ تک لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ انھوں نے موت کو بھی اختتام نہیں سمجھا بلکہ ایک نئی زندگی کا دروازہ جانا۔ ۵۳؎

ناصر کاظمی کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر دوست کو آزمانے اور اس کا امتحان لینے کے بعد اس کی دوستی کو قبول کرتے تھے۔ بعض کو وہ بہت جلد کامیاب کر دیتے اور بعض کا وہ برسوں امتحان لیتے اور کسی نہ کسی بات میں فیل کرتے رہتے تھے اور تو اور ناصر بعض لوگوں سے چائے پینا بھی گوارا نہیں کرتے اور بعض سے وہ چائے تو پی لیتے مگر بات کرنا

مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ناصر نہ صرف اپنے دوستوں، بیوی، بھائی اور بیٹوں کا امتحان لیتے تھے بلکہ سب سے زیادہ کڑے امتحان وہ خود اپنے لیا کرتے تھے کیوں کہ وہ جوکھم پسند انسان تھے یہ ان کی خاص روش تھی۔۵۴

ناصر کاظمی کے بچپن کے دوستوں میں افتخار اور محمد علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے ہم جماعت ساتھیوں میں پشاور کے ذوالفقار علی، وحید الدین اور رتن لعل کے علاوہ خاص دوست شامل ہیں۔ ناصر کاظمی کے مخلص دوستوں میں سید احمد شجاع کے علاوہ شیخ صلاح الدین، نور عالم، اکرم کاظمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے سب سے پیارے دوست کا نام حفیظ ہوشیار پوری ہے جن کے ساتھ انھوں نے طویل عمر گزاری۔ حفیظ کی بہت سی غزلیں ناصر کی صحبت کا نتیجہ ہیں۔ حفیظ ایک اچھے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ پرانے خیالات کے مالک تھے آنکھیں ذہین، چمک دار، سیاہ رنگ، گالیں پچکی ہوئیں، سفید بال، کہیں کہیں سیاہی بھی، دبلا پتلا مخلص اور وضعدار انسان تھے۔۵۵

غالب احمد، احمد مشتاق اور انتظار حسین ناصر کاظمی کے خاص دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں جن کے ساتھ ناصر نمکین دال، سویاں، شاہی کباب، چائے اور سگریٹ کا مزہ لیتے تھے۔ انتظار حسین ناصر کے بہت ہی خاص دوست تھے، ناصر ان کے تعلق سے کہتے ہیں:

> ''انتظار حسین کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ وہ مردہ لمحوں کو
> زندہ کر دیتا ہے۔ وہ لکھنا جانتا ہے۔''۵۶

ناصر کے دوستوں میں انتظار حسین کے علاوہ ریاض، طفیل، کاظمی، ڈاکٹر عبادت، مشکور حسین، شاہد حمید، شہزاد، احمد مشتاق، فرہاد زیدی، ریاض اور صفدر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جن کے ساتھ ناصر کاظمی کی محفلیں چلتی رہتی تھیں۔ مظفر علی سید، ناصر کے ایک

ایسے دوست تھے جو پرخلوص طبیعت کے ساتھ ساتھ نت نئے طریقوں سے ان کی خاطر مدارت کرتے رہتے اور شرارتیں بھی کیا کرتے۔ مظفر علی ناصؔر کاظمی کی بہت قدر کرتے تھے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ، قابل دوست، شاعر، صاحب ذوق، صاحب دل اور صاحب نظر نوجوان ہونے کے علاوہ ایک کھرے انسان بھی تھے۔ ۵۷؎

ناصؔر کاظمی کے کا ایک دوست بہت ہی خاص ہے جسے یہ آنکھ کا تارا کہہ کر مخاطب کرتے تھے یہ وہ دوست ہے جس نے زندگی بھر ناصؔر کا ساتھ دیا۔ ان کے تعلق سے ناصؔر کہتے ہیں:

''سفر منزل کے آخر تک میری آنکھوں میں رہا۔ اب میرے دل میں ہے جس قدر احسان اس نے مجھ پر کیے ہیں، جتنا پیار اس نے مجھ سے کیا ہے اس کا بدلہ چکانے کے لیے دوسری زندگی چاہیے سو وہ تو ناممکن ہے لیکن کاش کوئی غائبانہ طاقت اسے نیک صلہ دے، وہ ہنستا رہے خوش رہے۔'' ۵۸؎

یوں تو سید محمود، انتظار حسین کے خاص دوست رہے ہیں مگر آہستہ آہستہ وہ ناصؔر کے بھی قریب آگئے اور یہ دوستی ناصؔر کی موت تک قائم رہی۔ سید محمود ادب کے بہت شوقین تھے انھوں نے مغربی ادب کا بھی مطالعہ کیا اور وہ ایذرا پاؤنڈ کے بے حد مداح تھے۔ اس کی ہر تحریر ان کے پاس موجود تھی۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ ناصؔر نے بھی ایذرا پاؤنڈ کا مطالعہ کیا اور اس کی پیکر تراشی سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی شاعری میں پیکر تراشی کا بھرپور استعمال کیا۔ ناصؔر کو سید محمود کے اخلاق، اخلاص اور آداب بہت پسند آئے اور وہ ان کے ذوق کا برملا اظہار کرتے تھے کیوں کہ وہ ذوق کے اظہار میں بہت

بے باک تھے یہ ان کا خاص وصف ہے کیوں کہ ایسے شخص بہت کم ہوتے ہیں جو سامنے والے کے ذوق کا واضح اور فوراً اظہار کرے۔ ۵۹؎

ناصؔر کاظمی کے احباب میں صرف انسانوں ہی کی فہرست شامل نہ تھی بلکہ چرند، پرند، جانور وغیرہ کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی چیزیں تھیں جو ان کو بہت پسند تھیں مثلاً گلیاں، اندھیرے، چاند، دکانیں، چوکی دار، کتے، ہوٹل، چائے، کافی، انڈے، مکھن، مرغ، پرند کا گوشت، شکار، شطرنج، شاعری، کبوتر، خوبصورت اور ذہین دوست، خوش پوشی (جو ان کو میسر نہ تھی)، موسیقی، غزل، غزل مسلسل وہ بھی صرف ان کے انداز کی وغیرہ الغرض یہ ناصؔر کاظمی کی زندگی کے بے شمار اور لاتعداد دوست ہیں جو انھیں ہر کوئی مختلف انداز سے پہچانتا ہے۔ ناصؔر کا کوئی دوست بے وفا نہیں تھا بلکہ وہ خود لاپرواہ اور بے نیاز تھے۔ ۶۰؎

ناصؔر کاظمی کے اساتذۂ کرام میں ماسٹر پرتھمی چند، پنڈت ہیمراج، ہیڈ ماسٹر بھیجا مل، مولوی عنایت اللہ اور ماسٹر مول چند کے علاوہ بھی شامل تھے۔ جن سے وہ کچھ نہ کچھ سیکھتے رہے۔ ناصؔر کاظمی نے اساتذہ کی بعض زمینوں میں طبع آزمائی بھی کی ہے جن میں میرؔ، غالبؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ناصؔر کاظمی کو مطالعہ سے گہری دلچسپی تھی۔ ایسی کتابیں جن کے تعلق سے ناصؔر کو کوئی دلچسپی نہ ہو وہ اس کو دیکھتے بھی نہ تھے اور نہ ہی تجسس کا اظہار کرتے تھے بلکہ اس کے برخلاف اگر کوئی کتاب ناصؔر کاظمی کے تجسس اور تخیل کو چھیڑتی ہے تو وہ اس کتاب کے بارے میں جاننے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ چوں کہ رات اور تنہائی ان کی بہترین ساتھی رہے ہیں اس لیے وہ اکثر و بیشتر کتابوں کا مطالعہ رات ہی میں کیا کرتے تھے اور ایک رات میں ایک کتاب کا مطالعہ بہ غور کر لیتے تھے۔ مطالعہ کی ہوئی کتابوں کی تصدیق

کرنے کے لیے ان کے دوست اس کتاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے اوران سے طرح طرح کے سوالات پوچھتے تھے جس کے جواب میں ناصر اس کتاب کے مواد کے متعلق اس طرح سے گفتگو کرتے کہ ماننا پڑتا کہ واقعی انھوں نے اس کتاب کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ ۶۱

ناصر کاظمی کو فارسی ادب سے گہری دلچسپی تھی انھوں نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے۔

علاوہ ازیں انہوں نے اردو ادب کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا۔ وہ ولی اورنگ آبادی کی شاعری سے متاثر تھے۔ مثال کے طور پر ولی کا یہ شعر انھیں بے حد پسند تھا۔

ہر چند جگ کے بخت سیاہوں میں ہیں ولے
کاجل ہو جا بسے ہیں سجن کے نین میں ہم

ناصر کاظمی ولی کے علاوہ دیا شنکر نسیم دہلوی، شاگرد آتش دہلوی کی مثنوی ''گل بکاولی'' کو اکثر بڑھا کرتے تھے۔ ناصر کے خیال میں یہ لور کا ہسپانیہ کے شاعر سے بعض باتوں میں ملتے جلتے تھے اس مثنوی کو ناصر اردو کی بڑی مثنوی مانتے تھے۔ ۶۲

ناصر کاظمی نے اردو کے شعرا میں میر تقی میر کا خاص مطالعہ کیا کیوں کہ وہ میر سے بہت مانوس تھے اس کے علاوہ آپ نے مصحفی کا بھی مطالعہ کیا اوران کی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ مصحفی کا یہ شعر انھیں بہت پسند تھا:

اس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات
غنچے نے مسکرا کے کہا ہم نے پائی بات

چوں کہ ان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی اور علامہ اقبال کے کلام کے علاوہ جوش کے کلام کا بھی مطالعہ کیا اوران کو جوش کے یہ مصرعے بہت پسند تھے ع

سورج پہ جس کا ہاتھ ہے اور پاؤں چاند پر

گرتے ہوئے درخت سلگتے ہوئے مکان

پھول کو سونگھ سانس لے گہری

ناصر کاظمی کو مغربی ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ابتدا میں انھوں نے سر آرتھر ایڈنگٹن کی تصنیف ''وسیع ہوتی ہوئی کائنات''، سر جیمز جین کی ''ہمارے گرد کائنات''، ہربرٹ ریڈ کی ''فن اور معاشرہ''، سوزن لینگر کی ''فلسفے کا نیا آہنگ'' اور ''احساس و ہیئت'' کا مطالعہ کیا اس کے علاوہ انھوں نے سو سے زائد انگریزی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان پر اپنے دوستوں سے سیر حاصل گفتگو بھی کی۔ ناصر کاظمی کو انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور ہسپانوی شعرا کے انگریزی تراجم سے دلچسپی رہی ہے۔[۶۳]

ناصر کاظمی نے جرمن شاعر رلکے کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ وہ اسے بڑا شاعر مانتے تھے اور اس کی شاعری سے متاثر تھے اس کے علاوہ انھوں نے فرانسیسی شعرا رامبو اور رابنسن کا بھی مطالعہ کیا۔ انھوں نے ۲۴/ دسمبر ۱۹۵۱ء سے اطالوی شاعر Loopardi کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ علاوہ ازیں ناصر نے ایک چھوٹی سی مگر معنی خیز کتاب ''Philosophy in a new key'' کا مطالعہ کیا۔[۶۴]

ناصر کاظمی اسپینی شاعر لورکا کو بے حد پسند کرتے تھے۔ انہوں نے کولرج کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ اس کی نظم ''قبلا خان'' کے تعلق سے کہتے ہیں:

''اس نے عقل مندی یہی کی کہ نظم کو ادھورا چھوڑ دیا

---یہ نظم آوازوں کا کرشمہ ہے اس میں Floating

Effect of the Whole ہے۔ کولرج کی اس نظم

میں معنی کی بجائے معنی کی روح متاثر کرتی ہے۔''۶۵؎

ناصر کاظمی نے Loren Eiseley کی تصنیف ''The Immence Journey'' کا بھی مطالعہ کیا جس کے یہ مضامین ان کو بہت پسند آئے۔۶۶؎

The Great Deeps, How Flowers Changed The World, The Judgement of the Birds, The Bird and the Machine.

ناصر کاظمی والٹر دی لامئیر کی دو کتابوں کے بہت شیدائی رہے ہیں ان کی پہلی تصنیف ''Behold the Dreamer'' ہے جو بچپن کے تعلق سے دنیائے ادب وشعر اور علم و فلسفہ کی کتابوں کے اقتباسات پر مبنی ہے اور دوسری تصنیف ''محبت'' کے اقتباسات پر مبنی ہے چوں کہ ان دونوں موضوعات سے ناصر کو گہرا لگاؤ رہا ہے اس لیے اس کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مارک وان ڈوران کی عالمی شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔۶۷؎

ناصر کاظمی نے رشیل کارسن کی تصانیف ''سمندر ہمارے گرد'' اور ''سمندری ہوا کے تلے'' کے ساتھ ساتھ ''سمندر کے کنارے'' کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اس مصنفہ کی تحریروں سے بہت محظوظ ہوا کرتے تھے اور مزے لے لے کر پڑھتے تھے پھر اپنی گفتگو میں اس کا ذکر چٹخارے لے لے کر کیا کرتے تھے۔۶۸؎

ناصر کاظمی Saint Exupery کی تصنیف ''ہوا، ریت اور تارے'' سے بہت متاثر تھے اور اس کے پیرے کے پیرے ان کو مہینوں یاد رہتے تھے۔۶۹؎

ناصر کاظمی جب اپنے دوست واحباب کے ساتھ ہوتے تو اردو ادب کے علاوہ

فارسی، انگریزی، چینی اور ہسپانوی ادب سے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے جس کو وہ لوگ بہت اہتمام کے ساتھ سنتے تھے مگر بعض لوگ ایسے ہوتے تھے جو ان کی گفتگو سے تنگ بھی آجایا کرتے تھے مگر ان سے کچھ کہنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔٧٠

ناصؔر کاظمی نے اردو ادب کے مشہور شاعر میر تقی میر کے دیوان کا انتخاب کیا۔

ع فرہاد کے ذمے بھی عجیب کوہکنی ہے

انھوں نے میؔر کے علاوہ فراؔق، نظیؔر، ولؔی دکنی، انشاؔء کے علاوہ دیگر کلاسیکی شعرا کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا۔

ناصؔر کاظمی کے آباو اجداد پہلے پہل شیعہ نہ تھے بلکہ ان لوگوں نے ایران پہنچ کر شیعہ مذہب اختیار کیا تھا۔ ناصؔر کاظمی اپنے مذہب کے تعلق سے بیان کرتے ہیں:

> ''مذہب میرا اشاعری اور قبیلہ میرا ہاشمی ہے۔ دین میرا اسلام ہے اور کتاب قرآن مجید پاک جو میرے جدامجد، شافع محشر سرکارِ رسالت ختمی مرتبت نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ پیر طریقت میرا جداعلیٰ امام اول علی مرتضیٰ ہے اور مورث اعلیٰ میرا علیؓ کا لخت جگر امام ہفتم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہیں جن کے خلف حضرت حسن الخاطب میرے جداعلیٰ ہیں۔ علیؓ کا شیعہ ضرور ہوں مگر میرے عقیدے میں نہ تبرے کا کوئی دخل ہے نہ تقیے کو۔ میرے دوست وہی ہیں جو خدا کے دوست ہیں، انبیاؑ کے دوست ہیں، حضور پاکؑ کے دوست ہیں، علیؓ

کے دوست ہیں اور آئمہ اطہار کے دوست ہیں۔ بعض
شیعہ رسوم میں شرکت اس لیے کرتا ہوں کہ ان سے
آلِ نبیؐ اور آلِ اولادِ علیؓ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ مجلس عزا
امام مظلوم اور شہدائے کربلا کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شبیہ
ذوالجناح علم اور تغزیے شہدائے کربلا کی یادگاریں ہیں
اس لیے ان کا احترام بھی مجھ پر اور میری اولاد پر
واجب ہے اگر بعض واعظین اور عزادار کوئی نامناسب
یا غلط حقائق بیان کرتے ہوں تو میں اور میری اولاد اس
سے بری الذمہ ہیں۔'' [۱]

ناصرؔ کاظمی بہ ظاہر شیعہ مذہب کے ماننے والے تھے مگر وہ صرف قرآن مجید کے مطابق زندگی گزارنے کے آرزومند تھے۔ قرآن مجید پر ان کی نظر گہری تھی اور وہ اس کا مطالعہ نہایت دلجمعی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ جو قرآن پاک کا مطالعہ نہیں کرتے ان کے تعلق سے کہتے ہیں:

''جس نے قرآن نہیں پڑھا وہ حکمت، عبرت، حیرت
کی منازل سے محروم رہا اور وہ ہرگز ہرگز اچھا شاعر نہیں
ہوسکتا۔'' [۲]

ناصرؔ کاظمی کی اپنے دیرینہ دوست شیخ صلاح الدین سے قرآن اور اسلام کے موضوع پر کافی بحث ہوا کرتی تھی پھر اس کے بعد حضرت محمدؐ پر گفتگو کیا کرتے تھے اور آپؐ کے فضائل اور اطوار پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ناصرؔ قرآن مجید کو ایک الہامی کتاب مانتے ہیں وہ اللہ کا کلام ہے، وہ A book of light ہے، قرآن مجید کو Divine book اور A

book of all times ہونے پر بصیرت افروز باتیں کیا کرتے تھے۔۳ے

چوں کہ ناصر کاظمی کی کالج کی تعلیم کسی وجہ سے تکمیل کو نہ پہنچ سکی تھی اور کوئی ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے ناصر کاظمی کے لیے صرف کلرکی کی راہ کھلتی تھی اور یہ راہ ناصر کو قطعاً قبول نہ تھی۔ اسی لیے وہ بے روزگار تھے اور بیروزگاری نے انھیں کمھلا کر رکھ دیا تھا تاہم مختلف اوقات میں انہیں عارضی ملازمتیں ملتی رہیں۔

ناصر کاظمی کا بے روزگاری کی وجہ سے یہ حال ہو گیا کہ بہت سے لوگوں، ہوٹل والوں اور پان والوں کے مقروض ہو گئے اس لیے ان کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ کسی طرح سے یہ قرضہ اُتر جائے۔۴ے

ناصر کاظمی گرچہ بہت خوش خوراک تھے مگر بے روزگاری کی وجہ سے وہ اکثر دال، روٹی، مٹر اور چائے پر قانع رہتے تھے۔۵ے

ناصر کاظمی اپنی تخلیقات کی کمائی کے ذریعہ بھی اپنی اور اپنے خاندان والوں کی ضروریات پوری کرنے کے قائل نہ تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا پہلا مجموعہ کلام ''برگ نے'' کی اشاعت کے بعد کسی دوسرے مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں کوئی تیاری نہیں کی۔۶ے

ناصر کاظمی نے نور عالم الائیڈ پریس میں بہ طور کمرشیل آرٹسٹ خدمات انجام دیں۔ ان کی دن بھر کی خدمت کا صلہ انھیں سات روپے کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ یکم اگست ۱۹۶۴ء کو ریڈیو پاکستان لاہور میں بہ طور اسٹاف آرٹسٹ کے وابستہ ہوئے۔۷ے

انھوں نے ریڈیو پر ملازمت کے دوران کئی فیچرز بھی لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ ان کے فیچرز میں ''ایوانِ غزل'' بہت مشہور رہے۔۸ے

اس کے علاوہ ''دامانِ بہار'' اور ''غزل در غزل'' کے ساتھ ''صبح روشن''، ''موج

خیال'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ۷۹؎

ہندوستان کا پاکستان پر ۶/ دسمبر ۱۹۶۵ء کو حملہ ہوا۔ جس کے نتیجہ میں ناصؔر نے متعدد ترانے تخلیق کیے جن میں سے چند ایک قابلِ ذکر ہیں۔ ۸۰؎

ع ہر محاذ جنگ پر ہم لڑیں گے بے خطر

ع پاک فوج کے جواں تو ہے عزم کا نشاں

پاک ارضِ وطن کے جیالے

یہ جواں ہیں بڑی شان والے

مگر یہ ترانے تخلیق کرنے والا شاعر، ان کی غزلوں، نشاط خواب، سر کی چھایا اور پہلی بارش کے شاعر سے بالکل مختلف بھی اور منفرد بھی۔

علاوہ ازیں ناصؔر کاظمی نے اردو کے تین مشہور ادبی رسائل ''اوراق''، ''خیال'' اور ''ہمایوں'' کی ادارت بھی کی۔

ناصؔر کاظمی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''برگ نے'' ہے جو مکتبہ کارواں لاہور سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''دیوان ۱۹۷۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک وہ شعر نہ کہہ سکے مایوسی کا عالم طاری رہا پھر اچانک ان پر شاعری کا دروازہ کھل گیا اور مسلسل شعر وارد ہونے لگے اور ایک مجموعہ مرتب ہوگیا جسے پہلی بارش کے نام سے (۱۹۷۵ء) میں شائع کیا گیا۔ ان کی نظمیں ''نشاط خواب'' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد ''سر کی چھایا'' جو کہ منظوم ڈرامہ ہے وہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ نثر کا مجموعہ ''خشک چشمے کے کنارے'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں ناصؔر نے کلاسیکی شعرا کے انتخابات بھی کیے جن میں انتخابِ میؔر، انتخابِ ولؔی، انتخابِ نظؔیر اور انتخابِ انشا قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ناصؔر کی ڈائری، چند پریشان کاغذ کے نام

سے ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آئیں۔ ۸۱

''پہلی بارش'' کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں تمام غزلیں ایک ہی زمین میں کہی گئی ہیں جس کی وجہ سے یہ مجموعہ اردو شعری ادب میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ پہلی بارش کی تمام غزلوں کی ردیف ''تھا'' ہے۔ گویا شاعر کا ذہن ماضی سے آباد ہے۔ ان غزلوں میں ناصرؔ کا شعور ایک ایسی منزل سے گزر رہا ہے جو مسلسل آگے بڑھتا جاتا ہے کبھی ناصرؔ خواب سے دوچار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی جیتے جاگتے مظہر سے ۸۲

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

جو پایا ہے وہ تیرا ہے
جو کھویا ہے وہ بھی تیرا تھا

انھوں نے پہلی بارش میں شاعری اور داستان گوئی کا ایک ایسا آمیزہ تیار کیا جو غزل کی پوری روایت کے لیے نیا اور غیر مانوس تھا۔ پہلی بارش کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے سہیل احمد خاں لکھتے ہیں:

> ''پہلی بارش'' میں سفر کے راستے پر آبی مناظر پتھر کے شہر، گونگے ٹیلے، ندیاں، کشتیاں، پہاڑیاں، ہرے جنگل، سونے اسٹیشن، پیاسی کونجیں، سیڑھیاں اور آنگن نظر آئے ہیں اور اس تجربے کی مختلف کڑیوں کو مربوط کرتے ہیں، فطرت اس پورے سفر میں ہر جگہ شریک

ہے بلکہ وہ انسانی تعلقات کے لیے تناظر کا کام کرتی
ہے۔"۸۳

ناصر کاظمی اپنے پورے کلام میں ایک عظیم و معتبر شاعر کے طور پر ظاہر ہوئے ہیں ان کا ہر مجموعہ کلام ایک الگ جہاں کی حیثیت رکھتا ہے اور زیادہ تہہ دار ہوتا ہے۔"سر کی چھایا" ایک انوکھا جہاں ہے کیوں کہ اس میں شاعری کے ساتھ ساتھ کہانی، موسیقی اور تھیٹر، فلم اور ٹیلی ویژن کی تراکیب باہمی سے نیا فن تخلیق پاتا ہے۔۸۴

ناصر کاظمی کے دوست مظفر علی سید ڈانٹے کی مشہور تنقیدی کتاب Eloquentio کا انگریزی ترجمہ لائبریری سے لے آئے اور کچھ دن اس کے متعلق ناصر سے گفتگو کرتے رہے۔ ناصر نے حسب معمول اس گفتگو سے مرکزی خیال نکال لیا اور اپنے تخیل میں رچا بسا لیا اور آخرکار ایک دن انھوں نے ایک طبع زاد اور اوپیرا "سر کی چھایا" تخلیق کیا۔ یہ اوپیرا نہ صرف اردو میں سب سے پہلو دار اوپیرا ہے بلکہ وہ اوپیرا ڈرامے اور فلم کی تکنیک کا حسین و اعلیٰ امتزاج ہے۔ ناصر نے اس اوپیرا میں مغربی ڈرامے کے برخلاف سنسکرت ڈرامے کے اوزان برتے ہیں۔ انھوں نے ہر کردار کے مختلف اوزان مرتب کیے اور اس کی زبان میں بہت سے تجربے بھی کیے ناصر نے دوہے، پٹیالے، انبالے کی علاقائی زبان کے لب ولہجہ سے ایک ڈرامائی اوپیرا کی شاہکار تخلیق کی۔ یہ ایک معمولی کام ہرگز نہ تھا کیوں کہ ایک علاقائی بولی کو ادبی زبان بنانا کسی معجزے سے کم نہیں۔۸۵

ناصر کاظمی جب کوئی مضمون تحریر کرنے والے ہوتے ہیں تب ان کا ایک خاص طرز تھا اور وہ یہ کہ اس مضمون کے تعلق سے لوگوں کے سامنے اپنے خیالات دہراتے رہتے تاکہ یہ دیکھیں کہ ان کی باتوں کا سامنے والے پر کچھ اثر پڑ رہا ہے یا نہیں۔ اس

طرح ناصؔر کے کئی ایک مضامین زبانی سناسنا کر تحلیل ہو جاتے تھے انھیں لکھنے کی نوبت نہیں آتی تھی لیکن ناصؔر کاظمی جب کوئی مضمون تحریر کرتے تو اس کا اسلوب بالکل نیا ہوتا۔ ۸۶

ناصؔر کاظمی نے میؔر پر ایک مضمون قلم بند کیا جو ''بنائے تازہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مضمون کو تاریخی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ اس میں ناصؔر نے میؔر کے عہد کو ایک رات سے تعبیر کیا تھا کہ ان کے عہد کی رات ہمارے اپنے عہد سے آملی ہے۔ ۸۷

اس کے علاوہ انھوں نے ایک اور مضمون ''میر فہم'' کے نام سے لکھا۔ جو بہت ہی معنی خیز ہے۔

ناصؔر کاظمی نے ۱۶/ فروری ۱۹۵۲ء کو غالبؔ پر ایک مضمون تحریر کیا جو ''غالبؔ اور زینت محل'' کے نام سے آفاق میں شائع ہوا۔ جو بہت ہی دلچسپ ہے۔ ۸۸ چوں کہ ناصؔر بہت اچھے مضمون نگار تھے اس لیے کئی ایک رسائل اور اخبارات کے مدیر، ان سے مضامین لکھوایا کرتے تھے جن میں قابلِ ذکر مضمون ''ایک قوم ایک زبان'' ہے یہ بھی آفاق میں شائع ہوا۔

ناصؔر کاظمی کو خطوط نگاری کا بے حد شوق تھا۔ انھوں نے فیضؔ کے علاوہ جوشؔ، فراقؔ، عسکریؔ، یوسف ظفر، عنصؔر، مجیؔد امجد، حامؔد عزیز مدنیؔ، سلیم احمد، قرۃ العین حیدر، غالبؔ اور دیگر اہل قلم حضرات کو خطوط تحریر کیے۔ ۸۹

ناصؔر کاظمی نے امریکی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ بعض مفکرین کی کتابوں کے تراجم بھی کیے ہیں۔ ان کی ترجمہ نگاری بہ ظاہر اعلیٰ درجہ نہیں رکھتی لیکن اُن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ناصؔر کاظمی معدے کے کسی مرض سے متعلق کارمینا مکسچر کا استعمال کثرت سے کیا کرتے تھے لیکن کھانے پینے کے معاملات میں کوئی پرہیز نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی احتیاط

برتتے تھے۔ اگر وہ بخار میں مبتلا ہو جاتے تو کسی ہوٹل میں جا کر مرغ طلب کرتے اور جی بھر کر تناول فرماتے جس کی وجہ سے ان کے مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح کرتے تھے جس کی وجہ سے بیماری ان کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی اور وہ معدے پر زیادتیاں کرتے رہتے تھے جو انھیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ چوں کہ ناصؔر کو اچھے کھانوں کا شوق تھا اس لیے وہ ذائقے سے متعلق کسی بھی چیز کو نہیں چھوڑتے تھے۔۹۰

ناصؔر کاظمی ۵/ مارچ ۱۹۷۱ء کو البرٹ وکٹر ہسپتال کمرہ نمبر ۱۳ میں خون کی الٹی ہونے کے سبب داخل ہوئے۔ ان کی عیادت کے لیے شیخ صلاح الدین، سلیم الرحمٰن، انتظار حسین، شہزاد اور امر رضا تشریف لائے۔ بخار ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت مسلسل خراب ہو رہی تھی۔ ۱۱/ مئی ۱۹۷۱ء کی صبح ہوموگلوبن ٹیسٹ کروایا گیا۔ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو ناصؔر کی طبیعت پھر خراب ہوگئی اور حملہ بھی ہوا جس کی وجہ سے انھیں پھر دواخانے میں شریک کیا گیا، ایکسرے کروائے گئے جس کا نتیجہ خاطر خواہ ہی رہا۔ ڈاکٹر نے نئی دوا تجویز کی جس کا نام Bardase تھا اور کئی ایک انجکشن لگائے گئے جس کے باعث طبیعت میں سدھار آ گیا۔۹۱

آخرکار ناصؔر کاظمی سرطان کے مرض میں مبتلا ہوئے اور سرطان کے مرض کے آخری مراحل میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ سرطان زدہ خون کے اخراج کو ایک بار ہیٹ اور نظروں کے درمیان ایک پردے کے پیچھے سے دیکھا اور دوسری بار راست خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انھوں نے موت کو اپنے قریب بڑھتے ہوئے کئی مہینوں تک دیکھا مگر اپنی خود اعتمادی میں فرق تک آنے نہ دیا جب وقت ختم ہوگیا تو اسی خود اعتمادی اور متانت کے ساتھ موت کے ہمراہ نئے سفر پر روانہ ہوگئے۔۹۲

۱۶/ جنوری ۱۹۷۲ء کو ان کے بیمار ہونے کی اطلاع اخبارات میں شائع ہوئی جس

کی وجہ سے ادیبوں نے جلوس کی صورت میں ناصر کاظمی کی عیادت کی۔ حالاں کہ ان کی بیماری کا خرچ پنجاب گورنمنٹ اٹھانے کا بیڑہ لے چکی تھی مگر ان کی حالت سدھرنے کے بجائے، بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی آخر کار ڈاکٹروں کی کاوشوں، دوستوں کی دعاؤں نے بھی ساتھ نہ دیا اور وہ ۲/ مارچ ۱۹۷۲ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ۹۳

لاہور کی ادبی فضاؤں میں ناصر کاظمی کی شاعری اپنے شباب پر تھی کہ ۴۷ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا ۔

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

ناصر کی موت کے تعلق سے فراق ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''ناصر کاظمی کی جواں مرگی کا اثر لیتے ہوئے مجھے کیٹس اور دیگر نوعمر انگریزی شاعروں کی موت پر شیلی کا یہ فقرہ بے اختیار یاد آ جاتا ہے ۹۴ :

"The inheritors of unfulfilled renown..."

ناصر کاظمی زندگی اور شاعری میں تو جادو جگاتے ہی رہے مگر ان کی موت کے بعد ان کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا اور یہ جادو کالا نہیں بلکہ سفید تھا، بد نہیں، نیک تھا۔ ناصر کاظمی کی موت، ان کی شاعری ہی کا انوکھا روپ ہے ۔

اشارہ کرے جو نئی زندگی کا
ہم اس خودکشی کو روا جانتے ہیں

حوالے

۱۔ عبادت بریلوی، غزل مطالعہ غزل

۲۔ حامدی کاشمیری، ناصؔر کاظمی کی شاعری، ص:۲۲

۳۔ ممتاز الحق، جدید غزل کا فنی، سیاسی وسماجی مطالعہ، ص:۱۲۵

۴۔ عبادت بریلوی، جدید شاعری

۵۔ علیم صبا نویدی، پاکستان میں اردو شاعری

۶۔ علی جاوید۔ فکرو تحقیق، ص:۸۰

۷۔ ناصؔر کاظمی۔ ناصؔر کاظمی کی ڈائری، چند پریشان کاغذ، ص:۱۵

۸۔ ایضاً، ص:۱۵

۹۔ ایضاً، ص:۲۳

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۷

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۷

۱۲۔ ایضاً،ص:۸۱

۱۳۔ ایضاً،ص:۶۴

۱۴۔ سہیل احمد،طرفین

۱۵۔ علی جاوید،فکرو تحقیق،ص:۷۹

۱۶۔ سہیل احمد۔طرفین،ص:۶۲

۱۷۔ شیخ صلاح الدین،ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۴۰

۱۸۔ ایضاً،ص:۳۰

۱۹۔ ایضاً،ص:۹۲

۲۰۔ ناصر کاظمی،چند پریشان کاغذ،

۲۱۔ شیخ صلاح الدین،ناصر کاعظمی ایک دھیان،ص:۹۲،۱۰۳

۲۲۔ ناصر کاظمی،چند پریشان کاغذ،ص:۴۴

۲۳۔ ایضاً،ص:۲۶

۲۴۔ حامدی کاشمیری،ناصر کاظمی کی شاعری،ص:۲۱

۲۵۔ ناصر کاظمی،ناصر کاظمی کی ڈائری،ص ۱۹۶

۲۶۔ ایضاً،ص ۱۴۹

۲۷۔ صلاح الدین،ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۲۶

۲۸۔ ناصر کاعظمی،چند پریشان کاغذ،ص:۱۷

۲۹۔ ایضاً،ص:۹۸

۳۰۔ ایضاً،ص:۱۲۳

۳۱۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۱۱۵

۳۲۔ ایضاً،ص:۲۲

۳۳۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ،ص:۱۳۹

۳۴۔ ایضاً،ص:۱۶

۳۵۔ ایضاً،ص:۳۴۱

۳۶۔ ایضاً،ص:۲۲

۳۷۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۶۳

۳۸۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ،ص:۲۳، ۶۲، ۶۸، ۹۴، ۹۵

۳۹۔ ایضاً،ص:۶۷

۴۰۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۱۴

۴۱۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ،ص:۶۲

۴۲۔ ایضاً،ص:۴۷، ۵۷

۴۳۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۹

۴۴۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ،ص:۲۷، ۱۴۱

۴۵۔ ایضاً،ص:۱۶

۴۶۔ ایضاً،ص:۲۴

۴۷۔ علی جاوید، فکر و تحقیق،ص:۸۰

۴۸۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص: ۱۷۰

۴۹۔ شمیم حنفی، غزل کا نیا منظر نامہ

۵۰۔ امتیاز بلوچ، حاصل مطالعہ، ص: ۴۲، ۴۳

۵۱۔ حامدی کاشمیری، ناصر کاظمی کی شاعری، ص: ۴۹

۵۲۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص: ۶۴

۵۳۔ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان، ص: ۳۰

۵۴۔ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان، ص: ۳۲

۵۵۔ ناصر کاظمی، ناصر کاظمی کی ڈائری، ص ۶۳

۵۶۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص: ۱۰۰

۵۷۔ ناصر کاظمی، ناصر کاظمی کی ڈائری

۵۸۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص: ۵۷

۵۹۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان، ص: ۵۹

۶۰۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص: ۶۵

۶۱۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان، ص: ۱۷

۶۲۔ ایضاً، ص: ۸۰

۶۳۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان، ص: ۱۷، ۱۸

۶۴۔ ناصر کاظمی، ناصر کاظمی کی ڈائری

۶۵۔ ایضاً، ص: ۱۷۱

۶۶۔ ایضاً،ص:۲۰۷

۶۷۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۲۲

۶۸۔ ایضاً،ص:۲۱

۶۹۔ ایضاً،ص:۲۲

۷۰۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ،ص:۶۴

۷۱۔ ایضاً،ص:۲۷

۷۲۔ ایضاً،ص:۱۲۵

۷۳۔ ایضاً،ص:۳۷

۷۴۔ ناصر کاظمی، ناصر کاظمی کی ڈائری،ص ۶۷

۷۵۔ ایضاً،ص:۵۸

۷۶۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۱۲

۷۷۔ ناصر کاظمی، ناصر کاظمی کی ڈائری،ص ۲۱۰

۷۸۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان،ص:۴۱

۷۹۔ ناصر کاظمی، ناصر کاظمی کی ڈائری

۸۰۔ ایضاً،ص:۲۲۴

۸۱۔ وہاب اشرفی، تاریخ ادب اردو

۸۲۔ علی جاوید، فکر و تحقیق،ص:۸۶تا۸۹

۸۳۔ علی جاوید، فکر و تحقیق،ص:۹۱

۸۴۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان، ص:۳۲

۸۵۔ ایضاً، ص:۱۹، ۲۰

۸۶۔ سہیل احمد، طرفین، ص:۶۲

۸۷۔ کامل قریشی، اردو غزل، ص:۳۳۹

۸۸۔ ناصر کاظمی، ناصر کاظمی کی ڈائری، ص۵۲

۸۹۔ ایضاً، ص:۸۲

۹۰۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان، ص:۷۵

۹۱۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص:۲۸۹، ۲۹۱

۹۲۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان، ص:۳۰

۹۳۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص:۳۲۷

۹۴۔ علی جاوید، فکر و تحقیق، ص:۷۹

باب دوم

ناصر کاظمی کی شاعری

موضوعات

ناصر کاظمی جدید دور کے عظیم شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۴۰ء کے آس پاس کیا تھا۔ شروع میں یہ اختر شیرانی سے بہت متاثر تھے اور ان ہی کے رنگ میں شاعری کیا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں حفیظ ہوشیار پوری کی شاگردی میں غزل کہنا شروع کیا۔ ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں علامتوں کے ساتھ ساتھ پیکر تراشی سے بھی کام لیا ہے۔ انھوں نے تقسیم ہند کے فسادات اور خوں ریزی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا اپنی شاعری میں برملا اظہار بھی کیا۔

ناصر کاظمی کی شاعری متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ انھوں نے زندگی کے حسن کے متعدد پہلوؤں اور ان کی رنگارنگی کو اپنے اشعار میں سمیٹا ہے۔ ان کی شاعری اپنی تمام تر دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ یہ چند شعر ملاحظہ کیجیے

کس سے کہوں کوئی نہیں، سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میّتِ شہر بے کفن

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو سورج کرن کو ترسے گا

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسے اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

ان کی شاعری میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید موضوعات پر بھی اشعار اور نظمیں ملتی ہیں۔ ناصؔر کاظمی نے اپنی شاعری میں روایتی موضوعات کو بھی جدید رنگ میں پیش کیا ہے۔ اُن کا طرز احساس بھی نیا ہے اور طرز اظہار بھی۔ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے جس پر ہر شاعر نے ہر دور میں اظہارِ خیال کیا ہے لیکن ان کے عشق کا محرک روایتی عشق سے بہت الگ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پر عشق کی پہچان واقعیت اور ارضیت پر مبنی ہے جو موجودہ حالات کی دین ہے۔

اس بدلے ہوئے ماحول میں عشق کی پیش کش کا وہ انداز نہیں تھا جس کے سہارے روایتی غزل دلوں تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی تھی۔

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

ناصؔر کاظمی نے تقسیم کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات کو موضوع بنایا۔ اُن کی شاعری گزرے ہوئے موسم کی طرح ہے۔ ان کے یہاں حال سے زیادہ ماضی کا غم ملتا ہے۔ ماضی کے غم کے حوالے سے وہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور وہ بزرگ جو ہمارے درمیان سے اٹھتے جا رہے ہیں انھیں یاد کرتے ہیں۔

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

انھوں نے اپنے موضوعات میں ماضی کی یادوں کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کے تاثرات، غم ذات اور غم روزگار کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ ان موضوعات کی کامیابی اس وجہ سے بھی ہے کہ ان کی شاعرانہ فکر مضبوط سماجی بنیادوں پر قائم ہے۔

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں ہی جشن طرب منائے گئے

ناصر کاظمی کی شاعری صرف عصری میلانات ہی کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اُن کا میدان بے حد وسیع ہے۔ اس میں ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ انہوں نے انسانی زندگی کے کئی ایک پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا ہے۔

ناصر کاظمی کی شاعری میں کئی قسم کے موضوعات ملتے ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں ناصر کے یہاں مسلسل صدمے کے سبب دل کی ناتوانی کا ذکر بار ہا ملتا ہے جس میں اب تاب نہیں۔ مثال کے طور پر۔

کچھ یادگار شہر ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

کہاں تک تاب لائے ناتواں دل
کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں

اُن کا یہ موضوع بھی قابل توجہ ہے کہ انھیں اپنے محبوب سے بچھڑنے کا دکھ تو ہے لیکن اس میں وہ بے چینی وہ بے قراری نہیں ہے جو روایتی اردو غزل کا خاصہ ہے۔ یہ اشعار دیکھیے ۔

ترے بغیر وہ دن بھی گزر گئے آخر
ترے بغیر یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے

انھوں نے محبوب سے بیزاری کا عام اعلان کیا ہے ۔

برابر ہے ملنا نہ ملنا ترا
بچھڑنے کا تجھ سے قلق اب کہاں

ناصؔر کاظمی نے اپنی شاعری میں غم دوراں کو غم جاناں پر فوقیت دی ہے ۔

فکر یہ تھی کہ شب ہجر کٹے گی کیوں کر
لطف یہ ہے کہ ہمیں یاد نہ آیا کوئی

اُن کے بعض اشعار میں کلاسیکی اور جدید نقطہ نظر کا حسین امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔

دیار دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا

دل دھڑکنے لگا ہے آنکھوں سے
اب کسے رازداں کرے کوئی

ناصؔر کاظمی نے اپنی شاعری میں مختلف موسموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں قابلِ ذکر جاڑے کا موسم ہے۔ انھوں نے جاڑے سے متعلق مختلف نظمیں اور اشعار کہے ہیں

جن میں بہ طور خاص یہ شعر ہے۔

پھر جاڑے کی رت آئی
چھوٹے دن اور لمبی رات

چوں کہ آزادی کے بعد اردو شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری میں جو موضوعات غالب رہے ہیں ان میں درد و کرب، خوف، مایوسی، تنہائی، بدلتی ہوئی قدریں، سیاسی اتھل پتھل وغیرہ جیسے عناصر شاعری میں در آئے۔ لہذا ناصؔر کاظمی کو یہ تمام چیزیں اور بالخصوص تقسیم ہند نے بری طرح متاثر کیا اور جس کا گہرا اثر ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔

اک طرف خون دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشن جسم منائے گئے

کیا کہوں کس طرح سر بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصؔر
خار و خس کی طرح بہائے گئے

یہ چند ایک موضوعات ہیں جو ہمیں ناصؔر کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کی کئی ایک مثالیں ان کے کلام میں جا بہ جا بکھری پڑی ہیں۔ مرکزی نکتہ ان موضوعات کا البتہ ایک ہے۔ درد و غم اور انسانی زندگی کی بقا کی تڑپ، کہیں لفظوں میں، کہیں بین السطور میں ناصؔر کا یہ درد صاف پڑھا جا سکتا ہے۔

ناصر کاظمی کا آرٹ

ناصر کاظمی ہمیشہ خوشی کی تلاش میں رہتے تھے اور حسن تک پہنچنا چاہتے تھے لہذا ان کو اداسی سے اس لیے پیار تھا کہ وہ خوشی حاصل کرسکیں۔ چناں چہ شاعری بھی ان کے لیے مسرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھی، لہذا وہ لکھتے ہیں:

''شاعری اصل میں شروع میں نے اس لیے کی کہ یوں لگتا تھا مجھے کہ جو خوبصورت چیزیں میں فطرت میں دیکھتا ہوں، وہ میرے بس میں نہیں آتیں اور نکل جاتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ کچھ لمحے، کچھ وقت جو مر جاتا ہے وہ زندہ دوبارہ نہیں ہوسکتا، میں سمجھتا ہوں کہ شاعری میں زندہ ہوسکتا ہے۔ اسی لیے شاعری شروع کی۔''[۱]

انتظار حسین کے ایک سوال کے جواب میں کہ وہ شاعری کی طرف کیسے چل پڑے؟ کہتے ہیں:

"میرے سارے ہی شغل ایسے تھے جن کا تعلق تخلیق
سے اور فنون لطیفہ سے ہے۔ موسیقی، شاعری، شکار،
شطرنج، پرندوں سے محبت یہ سب جو ہے معلوم ہوتا ہے
کہ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔"[3]

ان کی شاعری کے آغاز میں ان کی والدہ، صحیح استاد ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ ناؔصر کاظمی اپنے دوست و احباب سے بھی مشورے لیا کرتے تھے جن میں حفیظ ہوشیار پوری قابل ذکر ہیں۔ عشق، شاعری اور فن یوں تو بچپن ہی سے ناؔصر کاظمی کے خون میں ہے مگر ان کے اس ذوق کی پرورش میں ان کے معاشقوں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ناؔصر کاظمی کو تیرہ برس کی عمر میں حمیرا نامی لڑکی سے عشق ہوا جو ناؔصر کاظمی کی والدہ سے گلستان، بوستان اور قرآن مجید پڑھنے آیا کرتی تھی۔ ان دنوں ناؔصر کاظمی اختر شیرانی کو بہت غور سے پڑھا کرتے تھے اور چھوٹی موٹی نظمیں لکھا کرتے تھے لیکن والدہ کے اصرار پر ناؔصر کاظمی نے غزل کہنا شروع کیا اور خود حمیرا بھی غزل کی شیدائی تھی لہذا یہیں سے ناؔصر کاظمی کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ ناؔصر کاظمی اس لڑکی سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ایسی محبت کی مثال دنیا میں بہت کم ملتی ہے مگر ناؔصر کاظمی نے اپنے والد کے ڈر اور اپنی آوارگی کی وجہ سے اس لڑکی کو کھو دیا۔[4]

ناؔصر کاظمی کی شاعری کی نشو و نما ۱۹۴۰ء کے آس پاس ہوئی ہے یہ وہ زمانہ تھا جس میں ناؔصر کو آشوب خیز قیامت سے دوچار ہونا پڑا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں حقیقت سے بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

کیا کہوں تم سے اب خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

ناصر کاظمی کو فطرت سے گہرا شغف تھا، فطرت ان کے دل کی آواز ہے، فطرت ناصر کاظمی کا واحد جذباتی سہارا ہے۔

کتنے مانوس لوگ یاد آئے
صبح کی چاندنی میں کیا کچھ تھا

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے

ناصر کاظمی کو فطرت سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ خود فطرت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"میں فطرت کا نمائندہ ہوں۔ جو دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، محسوس کرتا ہوں۔ ماضی، حال اور مستقبل کی قید سے باہر نکل کر بیان کرتا ہوں۔ لوگ میرے شعروں کو پچھلی رات غور سے پڑھیں، تجربے، مشاہدے اور علم و نظر سے کام لیں۔ میر و غالب کی اور بات، وہ بڑے اور پرانے لوگ تھے۔ بہت کم شاعر مجھے دل سے پسند ہیں وہی جو سچے اور منفرد، جبلی فطری ہیں۔" [۵]

ناصر کاظمی کو زندگی بہت عزیز ہے وہ اس سے اکتاتے نہیں، زندگی بسر کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ان کو انسان اور انسانی حسن کے علاوہ فطرت کے مناظر سے بھی دلچسپی رہی ہے اور موسموں سے لطف حاصل کیا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کی ترجمانی ناصر کاظمی نے اپنی شاعری بالخصوص اپنی غزلوں میں کی ہے۔

ساز ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شور درا غور سے سن

ناصؔر کاظمی نے اپنی شاعری میں گہرے جذباتی اور فطری واردات کا بیان بدلتے ہوئے مناظر کی مدد سے کیا ہے۔

بے نشاں ہے سفر رات ساری پڑی ہے مگر
آرہی ہے صدا دم بہ دم صبر کر صبر کر

ناصؔر کاظمی کی زبان سادہ اور پرُکار ہے۔ جس کے تعلق سے شیخ صلاح الدین لکھتے ہیں:

"اس کی مثال ایک قدیم چینی کے پیالے کی سی ہے جو بظاہر دوسرے پیالوں سے متمیز نہیں ہوتا مگر اس کی ہیئت کو اپنی شخصیت کے اندر بار بار اترنے کی اجازت دی جائے تو اس کا حسن واضح ہونے اور محسوس ہونے لگے گا۔"[۶]

ان کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ بہت کم لفظوں میں خیال وخواب کی متنوع تصویریں سجاتے ہیں اور وہ مستند یا روایتی لفظیات کے بجائے عام طور پر روزمرہ کی زبان میں بولے جانے والے سیدھے سادے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ دوسروں کی طرح عالمانہ زبان استعمال کرنے کے بجائے سادہ، بے تکلف اور مانوس زبان استعمال کرتے ہیں۔ ناصؔر کاظمی کا کل سرمایہ سیدھے سادے الفاظ ہیں جنھیں وہ تخیل کی مدد سے پیکروں میں تبدیل کرتے ہیں۔

اب نہ چیخیں گی اندھیری راتیں
چاند نکلا چمنستان چمکے

کیا کوئی آبلہ پا آتا ہے
آج کیوں خار بیاباں چمکے

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں جن الفاظ کا کافی شد و مد کے ساتھ استعمال کیا ہے اسے حامدی کاشمیری اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

''چہرہ، گھر، دیوار، ساون، پون، پتے، پازیب، رت، پھول، کاگا، آنگن، بوند، بادل، دھوپ، نگری، شام، خط، کھڑکی، پیاس، تھکن، دیا، مٹی، سفر، برف، ہوا، رستہ، کھیت، بستی، درخت، رات، گلاب، ہجر، بارش، خوشبو، آہٹ، پتھر، چشمہ، گگن، آشیاں اور جنگل وغیرہ۔ جیسے الفاظ کئی معنی اور مفہوم کے امکانات کو روشن کرتے ہیں۔''[۷]

ناصر کاظمی لفظوں کے استعمال میں بڑے کفایت شعار تھے کیوں کہ وہ ہر لفظ کی قدر و قیمت سے واقف تھے۔ شاعری بھی دراصل زبان کا علم نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیقی باز آفرینی کا نام ہے ان کی شاعری میں ایک لفظ بھی غیر ضروری نہیں ملتا۔ ناصر کاظمی لفظوں کے انتخاب پر کافی توجہ مرکوز کرتے ہیں جو حقیقی شاعری کو جنم دیتی ہے۔

ہم نے آباد کیا ملک سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ناصر کاظمی الفاظ پر بہت زیادہ زور دیتے تھے انھوں نے یہ کارنامہ ایک ایسے وقت میں انجام دیا جب بہت سے شعراء لفظوں کا خون کرنے پر تلے ہوئے تھے چناں چہ ان کے اس کارنامے پر جیلانی کامران نے لکھا ہے:

''ناصر کاظمی کی تخلیقی و ذہنی قوت نے زبان کو شاعری میں بدل کر شاعری کے بنیادی فکر کو ایسے ایک زمانے میں قائم کیا جو شاعری کو محض لفظوں کی کمپوزیشن سمجھتا ہے۔''[8]

ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق
شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے

ناصر کاظمی کے اشعار کی برجستگی اور بے ساختگی ان کی انفرادیت کو مستحکم کرتی ہے۔

یہ شب، یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منھ اندھیرے

ان کی شاعری میں غم، یاسیت، ملال، اداسی، یاد وغیرہ تخلیقی تجربہ بن کر رہ گئی اور یہی وہ تخلیقی قوت ہے جس سے ناصر کاظمی کی انفرادیت متعین ہوتی ہے۔

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تیری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

ناصر کاظمی کی شاعری میں ''یاد'' وہ بنیادی حصہ ہے جس کے بغیر ان کی شاعری، شاعری نہیں ہے چناں چہ اس تعلق سے علی جاوید کہتے ہیں:

''یاد وہ کلید ہے جس سے ناصر ہر رات اپنے سونے مکان کے زنگ آلود تالے کو کھولتا ہے۔ یاد ہی اس کے ماحول کی چپ اور دل کی ویرانی سے نجات دلاتی ہے۔ یاد ہی اس کے تخیل کو متحرک کر کے اسے تخلیقی سطح پر منتقل کر دیتی ہے۔''[9]

ناصؔر کاظمی نے نہ صرف اپنی انفرادی آواز کی تشکیل کی بلکہ اپنے لہجہ سے پڑھنے والوں کو متاثر کیا ۔

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہی راتوں میں زندگی کے مجھے

ناصؔر کاظمی کے اشعار اپنے اندر تجربات کی نئی دنیا رکھتے ہیں جس کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نئے دور کی ساری کسک ان میں سمٹ گئی ہو۔

انھوں نے روایت سے رشتہ نہیں توڑا بلکہ روایت کو تجربے سے ہم آہنگ کیا۔ غزل کی قدیم علامتیں ان کے یہاں نئے روپ میں ملتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نئی علامتوں اور نئے اشاروں کی تخلیق کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے۔ ناصؔر کاظمی نے غزل کو بالکل ہی ایک نئی شکل دی ہے۔ ان کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ حالات کو نئے زاویوں سے دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات میں جدت پائی جاتی ہے۔

ناصؔر کاظمی کے کلام میں عشقیہ واردات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ انہوں نے عشق کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ یہ زندگی پر محیط ہے۔ عشق کی کیفیات کا بیان ایک نئے انداز اور ایک نئے لب ولہجہ کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ کیفیات بالکل نئی ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری کی نوعیت تمام تر جذباتی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کی بنیادی حقائق سے بھی اس کا تعلق ہے۔ ان کے یہاں عشقیہ واردات کے ساتھ زمانے کے غم کا احساس انتہائی شدومد کے ساتھ ملتا ہے۔[10]

ایسا الجھا ہوں غم دنیا میں
ایک بھی خواب طرب یاد نہیں

تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا
تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا

انھوں نے عشق و محبت کو ایک نئی سمت دی ہے، یعنی روایت کے ساتھ جدت کو پیش کیا ہے۔ یہ جدت نادر تشبیہات یا استعاروں کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ عمومی سطح پر لفظوں کے استعمال سے واقع ہوئی ہے۔[11]

انھوں نے اپنی شاعری میں محبوب کی سراپا نگاری اور محبوب کی سیرت کشی ایک نئے اور اچھوتے انداز سے ہے جس میں شاعر کے نئے احساس اور نئے شعور کا عکس جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ان کی شاعری میں خارجیت پسندی کے ساتھ ساتھ داخلیت پسندی کا اثر بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے اشاروں، کنایوں، تشبیوں اور استعاروں میں محبوب کی رنگین تصویر کھینچی ہے

اس پیکر ناز کا فسانہ
دل ہوش میں آئے تو سنائے

وہ روح خیال ہو جان مضمون
دل اس کو کہاں سے ڈھونڈ لائے

راہوں پہ ادا ادا سے رقصاں
آنچل میں حیا سے منھ چھپائے

کچھ پھول برس پڑے زمین پر
کچھ گیت ہوا میں لہلہائے

ناصر کاظمی عشق کے المیے کو سچے دل سے محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی انھیں محبوب

کے قرب میں بھی اطمینان حاصل نہیں ہوتا ۔

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یوں بھی قیامت کبھی کبھی

انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انھیں کسی کی طلب تھی حد تو یہ ہے کہ اس کی صورت بھی یاد نہیں رہتی ۔

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں زندگی کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں جس کی جھلک ان کی غزلوں میں نظر آتی ہے۔

آنکھ کا تارا آنکھ میں ہے
اب نہ گنیں گے تارے ہم

جب سے دیکھا ہے ترے ہات کا چاند
میں نے دیکھا ہی نہیں رات کا چاند

ناصؔر کاظمی کے اشعار میں مسلسل تحرک صرف الفاظ ہی سے نہیں بلکہ بحر کے آہنگ اور اصوات کے تاثر سے بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری ان کے اپنے تاثرات، مشاہدات اور احساسات کی ترجمان ہے۔ انھوں نے زیادہ تر چھوٹی بحریں سیدھے

سادے الفاظ کے ذریعہ جذبات واحساسات کا واضح اظہار کیا ہے ان کے یہاں جو دردانگیزی پائی جاتی ہے وہ کسی اور کے یہاں کم ہی ملے گی۔ ان کی شاعری قاری کو کئی طرح سے متاثر کرتی ہے۔[۱۲]

پھول خوشبو سے جدا ہے اب کے
یارو یہ کیسی ہوا ہے اب کے

دوست بچھڑے ہیں کئی بار مگر
یہ نیا داغ کھلا ہے اب کے

ناصؔر کاظمی کی شاعرانہ عظمت اور انفرادیت کی بنیاد دراصل ان کے غیر متوقع احساس و کیفیات والے اشعار ہیں۔ ناصؔر کاظمی خود اپنی شاعرانہ عظمت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''میں لوگوں سے باتیں کرتا ہوں جن سے کتابوں اور براہ راست کتابی علم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میری باتیں کسی دوسرے آدمی سے نہیں ملتیں، یہی میری شاعرانہ عظمت ہے۔''[۱۳]

ناصؔر کاظمی کلاسیکی شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ کلاسیکی زبان میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں دیوانگی شوق، رگ جاں، شب ہجراں، شام فراق، حسن بہار، شب فرقت وغیرہ جیسی کلاسیکی ترکیبیں ملتی ہیں۔[۱۴]

ناصؔر کاظمی روایت کے وسیع تر مفہوم سے واقف ہیں وہ ایلیٹ کی طرح دور قدیم سے لمحۂ موجود تک کے ادبی سرمائے کو روایت کے شعور کے مساوی قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''روایت کے معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے۔۔۔یعنی روایت وہ روح ہے جو کسی عصر رواں میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے سے ہوسکتا ہے۔''[15]

ناصر کاظمی روایت کو اپنے عہد کے بدلتے ہوئے حالات کے پس منظر میں پرکھتے ہیں اور تقلیدی شاعر کو بے تعلق اور بے جاں قرار دیتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک انفرادی صلاحیت کا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔لہذا روایت کی یہ رائے ناصر کی یہاں میر پسندی کو بھی سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔چوں کہ ناصر کاظمی کا دور بہت ہی کربناک تھا، وہ ایک طرف ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہجرت کی سطح سے دوچار ہوئے تھے تو دوسری طرف معاصر عہد کی انتشار سے بھری ہوئی زندگی کی سطح۔یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی کو میر کے اجڑے ہوئے عہد کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میر سے ایک زمانی فاصلے کے باوجود ناصر کاظمی نے ان کے تجربوں میں خود کے بنیادی تجربوں کا عکس ڈھونڈ نکالا۔[16]

انھوں نے میر کی پیروی ضرور کی مگر تقلید نہیں۔ان کی شاعری میں زندگی کی قریبی چیزیں اور علامتیں پائی جاتی ہیں۔جن میں ریل، کرسی، سیٹی، اسٹیشن، چڑیاں، فاختہ، کونج، کمرہ، منڈیر، پیانو، گھاس وغیرہ۔یہ وہ الفاظ ہیں جو غزل کی صنف سے مانوس نہیں لیکن ناصر نے اتنی خوبصورتی سے ان کا استعمال کیا کہ وہ ایک خاص وصف بن گیا۔[17]

ریل کی گہری سیٹی سن کر
رات کا جنگل گونجا ہے

شہر کے خالی اسٹیشن پر
کوئی مسافر اترا ہوگا

آ بھی جا میرے دل کے صدر نشین
کب سے خالی پڑی ہے یہ کرسی

ناصؔر کاظمی اور ان کے معاصرین جن میں ابن انشؔا، خلیل الرحمٰن اعظمؔی اور مختار صدیقی وغیرہ کو تقریباً ویسی ہی محرومی کا سامنا کرنا پڑا جو میر تقی میؔر کے نصیب میں تھی۔ لہٰذا تقسیم ہند کے دور سے گزرتے ہوئے شعرا کو میؔر کا لہجہ بہت کام آیا۔ وہ ترقی پسندوں کے انقلابی لہجہ سے عاجز آ چکے تھے اسی لیے اس لمحے میں ان شعرا کو میر کی روایت ہی جاندار اور قابلِ تقلید لگی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شاعر اپنے شعری کیریر کے شروع میں بعض کامیاب شعرا کا تتبع کرتا ہے لیکن صرف اسی پر قانع ہو کر نہیں رہتا۔ ناصؔر کاظمی میؔر سے متاثر ضرور ہوئے مگر ان کا تتبع نہیں کیا انھوں نے خود لکھا ہے:

''میؔر کا چراغ تھوڑی دور تک راستہ دکھا سکتا، منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔'' ۱۸

ناصؔر کاظمی نے میر کو اپنے تخلیقی سر چشمے کی بنیادی حیثیت عطا کی۔ حالاں کہ ان کا اور میر کا عہد بہت مختلف تھا اور عہد کے مسائل اور تقاضے بھی مختلف تھے لیکن اس کے باوجود ہجرت کا جو کرب تھا جس سے ناصؔر کاظمی خود دوچار ہوئے، دربدری کی یہی کیفیت میؔر کے عہد میں بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ ناصر کا عہد جس بے اطمینانی اور عدم تحفظ کا شکار تھا کم و بیش یہی صورتِ حال میر کے عہد کی تھی۔ لہٰذا ایک لمبے عرصے کے باوجود ناصؔر کاظمی نے میر کے تجربوں میں اپنے تجربوں کا عکس تلاش کیا۔ ۱۹

شمس الرحمٰن فاروقی ناصؔر کاظمی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"ناصر کاظمی میر کے اسلوب کا اتباع کرتے ہیں اور چوں
کہ فراق بھی میر کے ہی اسلوب کے پیرو ہیں اس لیے
ناصر کاظمی اور فراق کا بھی رشتہ بہت قریبی اور مستحکم ہے۔
میر سے استفادہ کرنا اور چیز ہے اور میر کا اتباع (یعنی ان
کی رنگ میں غزل کہنا) اور چیز یہ بات تو تسلیم کی جاسکتی
ہے کہ ناصر کاظمی نے میر سے استفادہ کیا۔" [۲۰]

دراصل ناصر کاظمی میر سے اس لیے رجوع نہیں ہوئے تھے کہ ان کا کوئی اسلوب نہیں تھا بلکہ وہ میر سے روشنی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح جس طرح وہ غالب اور انیس کی شاعری کے بعض پہلوؤں سے استفادہ کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اسلوب اور لہجے کی انفرادیت کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں فارسی زبان سے بھی کام لیا ہے، فارسیت ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ انھوں نے بعض بہت ہی خوبصورت، برمحل فارسی ترکیبوں کا استعمال کیا ہے۔ ان کے یہاں فارسی مزاج کی شائستگی اور پیچیدگی موجود ہے۔

ہر سحر بارگاہ شبنم میں
پھول ملتے ہیں باوضو ہم سے

ہم سے روشن ہے کارگاہِ سخن
نفس گل ہے مشگ بو ہم سے

بھری برسات خالی جارہی ہے
سر ابرِ رواں دیکھا نہ جائے

دم مہتاب فشاں سے ناصؔر
آج تو رات جگا دی ہم نے

انھوں نے جن فارسی تراکیب کا استعمال کیا ہے اس میں ان کی جودت طبع اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ کارگاہ سخن، نفس گل اور دم مہتاب فشاں جیسی تراکیب ناصؔر کی فارسی دانی کو ظاہر کرتی ہے۔ ناصؔر کاظمی کی شاعری میں فارسی زبان ان کی شاعری کی برجستگی کو مجروح نہیں کرتی بلکہ فارسی تراکیب شعر کے سیاق وسباق میں ٹھیک بیٹھتی ہیں اور شعر مکمل طور پر بے ساختگی اور تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ ناصؔر کاظمی کی چند فارسی تراکیب مندرجہ ذیل ہیں:

صرصر آلام دوراں، خوف بے مہری خزاں، موسم طرب، شہر ماضی، شبنم زمزمہ پا، کارواں گلی وریحاں، اوراق گل، پردۂ گل، طلسم کم نگاہاں، شام وصال یار، مصورۂ غم، ملک سخن، صبح طرب، پردۂ شب، گل زمینوں، خشک رمنوں، گل شب تاب، ابلق صبح، نگہت گل اور شاخ شعاع خورشید وغیرہ۔[۲۱]

ناصؔر کاظمی کے کلام کی خوبی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان اشعار میں سیدھے سادے تجربات کو سہل ممتنع کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ہچکی تھمتی ہی نہیں ناصؔر
آج کسی نے یاد کیا ہے

میں تو آج بہت رویا ہوں
تو بھی شاید رویا ہوگا

آج تو میرا دل کہتا ہے
تو اس وقت اکیلا ہوگا

لہذا یہ ان کے کلام کی خاص خوبی ہے۔

ناصرؔ کاظمی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے عام تجربات کو ایک نئی زبان دینے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر ''رات''، ''ہجر'' اور ''شام'' جیسے الفاظ ان کے تجربات کی سیر کرواتے ہیں۔

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اۓ شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

میں تو ہلکان ہوگیا ناصرؔ
مدت سحر کتنی پھیل گئی

ناصرؔ کی شاعری کے تعلق سے مظفر علی سید کہتے ہیں کہ ناصرؔ کی شاعری کو ایک نئے مکاں کی تعمیر اور ایک نئی زمین کی دریافت کے پس منظر میں دیکھنا ہے یا ایک اجتماعی واردات کی بازگشت کے طور پر دیکھا ہے۔

چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''کبھی ناصرؔ کے لفظوں میں رگ عصر کا لہو خود بہ خود بولتا تھا اور اس کو یہ بات جتانے کی ضرورت بہت کم پیش آئی تھی۔ آزادی کے وقت اور اس کے فوراً بعد اس کی آواز میں ہم سب کا تجربہ شامل تھا۔۔۔'' ۲۲

''برگ نے'' میں ناصر کاظمی نے نئے طریقوں کی دریافت اور اظہار کا نیا طریقہ اپنایا۔ ناصرؔ نے مشاہدے کو اپنے تجربات کا اساس بنایا ہے ۔

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

اڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور
سرو ایک شوخ جواں تھا پہلے

ناصرؔ کاظمی تقسیم ہند کے خوف ناک فسادات اور مہاجروں کی بدحالی سے بری طرح متاثر تھے۔اپنی شاعری میں فسادات کا ذکر کرتے ہیں تو صرف واقعہ نگاری ہی سے کام نہیں لیتے بلکہ انسانی اقدار کی پامالی کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اس کا احساس بھی دلاتے ہیں۔

پھول تو کیا کانٹے بھی نہیں
کیسے اجڑے باغ ہرے

روداد سفر نہ چھیڑ ناصرؔ
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

یہ اشعار بھی دیکھیے۔

زمین لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگ آسماں دیکھا نہ جائے

حادثہ ہے کہ خزاں سے پہلے
بوئے گل، گل سے جدا ہوتی ہے

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

کچھ اور شعر۔

جو گفتنی نہیں وہ بات بھی سنادوں گا
تو ایک بار تو مل سب گلے مٹادوں گا

یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا اک دن
تمام شہر میں تنہائیاں بچھا دوں گا

چہکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصؔر
کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی اداسی ہے

انھوں نے ۱۹۴۷ء کی سیاسی واردات کو ایک تہذیبی المیے کے تناظر میں انھیں خطوط پر دیکھا ہے جس کی طرف میرؔ نے دلی کی بربادی کے ساتھ دل کی ویرانی کے ذکر میں اشارہ کیا ہے۔

ہجرت کے واقعہ کے بعد ناصؔر کاظمی کے نفسیاتی رویے میں گہری تبدیلی آئی، وہ ایک نئے ملک میں رہ کر بھی ذہنی اور جذباتی وابستگی قائم کرنے کی شعوری کوشش کے باوجود اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔ لاشعور کی یہ کارفرمائی ان کے رویے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر کہاں سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

ناصؔر کاظمی کو صرف اپنے ہی دکھ کا احساس نہیں ہے بلکہ وہ پورے قافلے کی بات کرتے ہیں۔ انھیں پوری انسانیت، پورا قافلہ، منزل کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے یہ صورتِ حال ان کے شخصی کرب میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غم صد کارواں دیکھا نہ جائے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

ان کی شاعری اس دور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی رعنائیوں اور دہشت پسندیوں کا شعور عطا کرتی ہے، جو ان کی ذات کے توسط سے منفرد تخلیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں حد درجہ شخصی لہجے کے باوجود اجتماعی زندگی کا کرب اور دکھ ملتا ہے ۲۳؎

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں

بازار بند، راستے سنسان، بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

ناصؔر کاظمی کو دراصل خوب صورت ماضی اور کلچر کے کھو جانے کا بہت زیادہ غم ہے۔ وہ گم شدہ محبوب کی یاد سے بے نیاز نہیں اس لیے ان کو یہ لاتعلقی کرب کا احساس دلاتی ہے۔

تنہا تنہا پھرتے ہیں
دل ویراں آنکھیں بے نور

ناصؔر کی یہ لاتعلقی ان کے خاص نظریہ حیات کا پتہ دیتی ہے۔

چناں چہ دور قدیم میں میؔر اور غالبؔ، موجودہ دور میں میرا جی، ناصؔر کاظمی، باؔنی، وزیؔر آغا اور بلراؔج کومل کی شاعری اپنے علامتی کردار کی بنا پر تجربات کی گہرائی اور پیچیدگی کا احساس دلاتی ہے۔

تقسیم ہند، خوف ناک فسادات اور مہاجرین کی بدحالی نے ناصؔر کے یہاں اداسی اور غم کی ایسی فضا پیدا کر دی ہے جو میؔر کی غمگین فضا سے ملتی جلتی ہے۔ دراصل ناصؔر کی شاعری میں اس لیے بھی غم کا پہلو زیادہ ہے کہ انھوں نے خود زمانے کے اس آشوب خیز

قیامت کو دیکھا تھا اور وہ خود بھی اس غم سے دوچار ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں غم کا بیان اتنی شدت سے نظر آتا ہے۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

یہ نگری اندھیاری ہے
اس نگری سے جلدی بھاگ

ناصؔر کاظمی کے تعلق سے امتیاز بلوچ اپنے ایک مضمون ''ناصؔر کاظمی کی شاعری'' میں فرماتے ہیں:

''بیسویں صدی میں راتوں کی بے نوائی کی شکایت کرنے والا ناصؔر کاظمی اپنے عہد کی ایک غم زدہ آواز ہے۔ میر تقی میر کی حسرت گفتار ایک بار پھر ناصؔر کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔'' [۲۴]

میر تقی میر کے برعکس ناصؔر کاظمی امید وبیم کے شاعر ہیں، وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ زندگی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی بلکہ وہ بدلتی رہتی ہے۔ ناصؔر کی نگاہیں بھی اس تبدیلی کو محسوس کرتی ہیں۔ لہٰذا وہ زندگی کے مسافر سے جاگتے رہنے کی خواہش کرتے ہیں۔

ختم ہوا تاروں کا راگ
جاگ مسافر اب تو جاگ

ناصؔر کاظمی صرف ماضی میں کھو نہیں جاتے بلکہ اچھے دنوں کے خواب بھی دیکھتے ہیں اور یہ خواب انتقامی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ نہایت ہی مثبت اور حوصلہ بخش ہیں جو

امید اور صبر کا اشارہ کرتے ہیں۔

یہ بجا کہ آج اندھیرا ہے ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے
جو خزاں کے خوف سے خشک ہے وہی شاخ لائے گی برگ و بر

ناصؔر کاظمی کی یہ موہوم سی امید انھیں کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ کبھی یہ امید "غم محبوب" بن جاتی ہے تو کبھی ان" کی آواز"۔ امید دراصل ناصؔر کی زندگی کا سہارا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہو۔

ہر منزل سے گزرے ہیں
تیرے غم کے سہارے ہم

رین اندھیری ہے اور کنارہ دور
چاند نکلے تو پار اتر جائیں

کیا خبر خاک سے ہی کوئی کرن پھوٹ پڑے
ذوق آوارگی دشت و بیاباں ہی سہی

ناصؔر کاظمی کی شاعری آواز اور خاموشی کا بہترین سنگم ہے۔ اگر یہ امر واضح ہو جائے کہ ناصؔر کاظمی کی غزلوں کو بلند آواز سے پڑھتے ہوئے خاموشی کا استعمال واضح ہو جائے تو ناصؔر کی شاعری کے اوصاف کھلنے لگتے ہیں۔ ناصؔر کے اشعار دراصل آواز، معنی اور خاموشی سے ترکیب پاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں چھپے ہوئے معنی خاموشی کا شعور حاصل کرنے کے بعد کھل جاتے ہیں۔ [۲۵]

لہٰذا ان کی شاعری میں آواز کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی ایک لازمی عنصر ہے اور ان کے شعری ارتقا میں آواز کے مقابل خاموشی کا عنصر مضبوط اور اہم ہے۔

ترقی پسند دور کی شاعری گھن گرج کی شاعری تھی تو ایسے دور میں ناصؔر کاظمی نے پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اپنی شاعری میں دھیمے الفاظ کے ذریعہ عصری آگہی کا بھرپور شعور دیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کیوں کہ یہ کام ایک مضبوط انفرادیت کا حامل شاعر ہی انجام دے سکتا ہے۔

ہم بھلا چپ رہنے والے تھے کبھی
ہاں مگر حالات ایسے ہوگئے

جیلانی کامران ناصؔر کاظمی کے تعلق سے کہتے ہیں:

''ناصؔر کاظمی شاعری کے جس گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس میں امراء القیس اور حافظ کے نام آتے ہیں۔ عرب اور عجم کی ذہنی وفکری روایت ناصؔر کے لفظوں میں دوبارہ زندہ ہوئی ہے۔ ناصؔر کاظمی ایک زندہ شاعر ہے اور اس کی زندگی ان اقدار کے ساتھ موسوم ہے جن سے ہم، ہماری تہذیب آئندہ نسلیں وابستہ ہیں۔۔۔ تاہم میں نے ناصؔر کاظمی کے مقام کو اس کے تہذیبی اور الہیاتی حوالے سے پہچاننے کی کوشش کی ہے۔''[۲۶]

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں بہترین تشبیہات واستعارات بھی ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تتلی کے پروں کی طرح ہے ذرا سا ہاتھ لگائیں تو سارے رنگ میلے ہوجائیں گے۔

حامدی کاشمیری نے صحیح لکھا ہے:

''ناصؔر کے اشعار منھ اندھیرے کھلے ہوئے پھول ہیں

جو اپنی تازگی، رنگ، خوشبو، جھلملاہٹ اور نور و سایہ کا
سحر جگائے ہیں اور خیال و خواب کی جادوئی تصویروں
میں جان ڈال دیے ہیں۔'' ۲۷

ناصر کاظمی نے بہترین تلمیحات استعمال کی ہیں۔ مثلاً

بے منتِ خضرِ راہ رہنا
منظور ہمیں تباہ رہنا

(برگ نے، ص:۱۱۲)

یوں ترے حسن کی تصویر غزل میں آئے
جیسے بلقیس سلیمان کے محل میں آئے

(دیوان، ص:۶۳)

دیکھ کر چلو ناصر
دشت ہے یہ فیلوں کا

(دیوان، ص:۱۳۸)

نو کا ہی بچوں کا جھولا
نو کا ہی پیری کا عصا تھا

(پہلی بارش، ص:۷۰)

رہ جنوں میں فرد کا حوالہ کرتا
یہ خضر رنجِ سفر کا ازالہ کیا کرتا

(ص:۱۲، غیر مطبوعہ کلام)

ناصر کاظمی نے نادر تشبیہات کا استعمال کیا۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہو

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی
(برگ نے،ص:۱۷)

آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر
عارض کہ شراب تھرتھرائے
(برگ نے،ص:۲۱)

اڑتی ہوئی زلف یوں پریشاں
جیسے کوئی راہ بھول جائے
(برگ نے،ص:۲۲)

عجب ہے رات سے آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے
(دیوان،ص:۶۴)

ایک نگر میں ایسا دیکھا دن بھی جہاں اندھیر
پچھلے پہر یوں چلے اندھیری جیسے گرجیں شیر
(دیوان،ص:۱۱۳)

مری بھری ہوئی آنکھوں کو چشم کم سے نہ دیکھ
کہ آسمان مقید ہیں ان حبابوں میں
(دیوان،ص:۱۴۲)

تیری ہلال سی انگلی پکڑے
میں کوسوں پیدل چلتا تھا
(پہلی بارش،ص:۴۸)

چندر کرن سی انگلی انگلی
ناخن ناخن ہیرا سا تھا
(پہلی بارش، ص:۵۲)

ماتھے پر سونے کا جھومر
چنگاری کی طرح اڑتا تھا
(پہلی بارش، ص:۷۲)

چاندی کا وہی پھول گلے میں
ماتھے پر وہی چاند کھلا تھا
(پہلی بارش، ص:۷۷)

اک رخسار پہ زلف گری تھی
اک رخسار پہ چاند کھلا تھا
(پہلی بارش، ص:۵۱)

ناصر کاظمی نے تشبیہ بالا ضافت سے بھی کام لیا ہے اور اس کا استعمال وافر مقدار میں کیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ابھی اور کتنی ہے معیاد غم
کہاں تک ملیں گے وفا کے صلے
(برگ نے، ص:۴۳)

زمین لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے
(برگ نے، ص:۵۶)

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنج بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

دیوانگی شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

(دیوان، ص:۱۱)

نیت شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں

(دیوان، ص:۱۳)

یہ محلاتِ شاہی تباہی کے ہیں منتظر
گرنے والے ہیں ان کے علم صبر کر صبر کر

(دیوان، ص:۲۱)

یادوں کی سیڑھی سے ناصرؔ
رات اک سایا سا اترا تھا

(پہلی بارش، ص:۶۱)

تنہائی کے آتشداں میں
میں لکڑی کی طرح جلتا تھا

(پہلی بارش، ص:۶۴)

جسم کی پگڈنڈی سے آگے
جرم و سزا کا دوراہا تھا

(پہلی بارش، ص:۶۶)

اے ساکنانِ خطۂ لاہور! دیکھنا
لایا ہوں اس خرابے سے میں لعلِ مدنی
(نشاطِ خواب، ص:۱۴)

ناصر کاظمی نے استعاروں کا نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے۔ استعارہ ان کے تجربہ کو غیر معمولی قوت بخشتا ہے۔ مثلاً

تو جہاں چند روز ٹھہرا تھا
یاد کرتا ہے تجھ کو آج وہ گھر

تو جہاں ایک بار آیا تھا
اک مدت سے ہے وہ گھر خاموش

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

کچھ مصرعے ملاحظہ کریں ع

ریت کے پھول آگ کے تارے

تری ہنسی کے گلابوں کو کوئی چھو نہ سکا

کشتیوں کی لاشوں پر

تنہائی کے آتش داں میں

تقسیم ہند کے تغیرات نے جہاں شعر و ادب کو متاثر کیا وہیں فنی سطح پر غیر معمولی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ جدید شاعری میں نہ صرف پرانی ترکیبوں، استعاروں اور

علامتوں سے انحراف ملتا ہے بلکہ نئی علامتیں اختیار کرنے ، الفاظ کو نئے معنی عطا کرنے اور نئے نئے تجروں کو پیش کرنے کا عام رواج رہا ہے۔ یہ رواج اس دور کے تقریباً سبھی شعرا کے یہاں کم و بیش دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ان سب میں ناصؔر کاظمی کے یہاں یہ رواج بہت زیادہ مقبول رہا ہے۔

''غزل'' دراصل ایک علامتی صنف ہے اس لیے ناصؔر کاظمی کے یہاں علامت نگاری کا فطری انداز ملتا ہے۔ چوں کہ ناصؔر کاظمی بھی انسانی تاریخ کے ایک بہت ہی نازک موڑ پر سامنے آئے لہذا ان کی شعری حسیت میں پیچیدگی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ ناصؔر کاظمی کی علامتی فکر عصری حالات کی پابند نہیں کیوں کہ تخلیق کرتے وقت جب شخصیت کے داخلی اور خارجی احساسات سامنے آتے ہیں تو ایک الگ ہی تجربہ جنم لیتا ہے اور اس کی تجسیم کاری ہی علامت نگاری کے لیے زمین ہموار کرتی ہے۔[۲۸] ناصؔر کے ان اشعار میں علامت نگاری کا نمایاں انداز ملتا ہے۔

یہ اندھیرے سلگ بھی سکتے ہیں
تیرے دل میں مگر وہ شعلہ نہیں

آتی رت مجھے روئے گی
جاتی رت کا جھونکا ہوں

ساری بستی سوگئی ناصؔر
تو اب تک کیوں جاگ رہا ہے

اس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی

شعلہ سا پیچ و تاب میں دیکھا
جانے کیا اضطراب میں دیکھا

ناصؔر کاظمی نے اس کے علاوہ گگن، پرندہ، طوفان، گھاس، آندھی اور پھول علامتی نوعیت کے الفاظ ہونے کے ساتھ ساتھ روزمرہ میں کہے جانے والے سادہ الفاظ کو علامتی ذہن عطا کیا ہے جو معمولی بات نہیں۔

ناصؔر کاظمی کی علامت نگاری کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''ناصؔر کاظمی کی شاعری کا جو رجحان ماضی میں تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ علامتی ذہن کی طرف بھی گامزن ہوسکیں گے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح انھوں نے یہاں بھی اپنے شاعرانہ ارتقاء میں ایک غیر متوقع منزل سر کر کے ہم سب کو متحیر کر دیا۔ ان غزلوں کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ناصؔر کاظمی کی بے وقت موت اس سے کہیں بڑا حادثہ تھی جتنا کہ ہم لوگ سمجھے تھے انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا:

میری نوائیں الگ میری دعائیں الگ
میرے لیے آشیاں سب سے جدا چاہیے'' ۲۹

کئی نقادوں نے ان کے یہاں رات، شہر، گھر، پانی اور آواز وغیرہ علامتوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے یہاں یہ تمام الفاظ اپنے سیاق وسباق میں علامتی ہو جاتے ہیں دراصل ان کی شخصیت میں جو محرومی اور افسردگی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ براہ راست اظہار ممکن نہیں۔

آج تو وہ بھی خموش سا تھا
میں نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی

ناصؔر کاظمی نے اپنی شاعری میں ''رات'' کی علامت کو بار بار استعمال کیا ہے۔ رات دراصل ان کی شاعری میں صنعتی دور کے قدموں کی چاپ معلوم ہوتی ہے۔ چناں چہ رات کے تعلق سے ناصؔر کہتے ہیں:

''رات کا تعلق حسن، تخیل، وجدان، وحدت فکر اور آرام سے ہے، جو اس دور میں نایاب ہے۔ اسی لیے کے ہر بڑے اور صحیح شاعر میں رات کا تصور بہ درجہ اتم ہے۔ میری شاعری پر رات کا گہرا سایہ ہے اور رات سے وابستہ تمام تخلیقات چاند، شبنم، نیند، خواب، پچھلا پہر، آخر شب، سرشام، ستارے، جگنو، چراغ، گوہر شب چراغ (خود کو کہا ہے) شعلہ، آگ، بانسری کی دھن اور آدھی رات وغیرہ وغیرہ۔'' [۳۰]

''رات'' دراصل ان کے یہاں تخلیقیت، اجنبیت، ویرانی، اداسی، لاتعلقی اور غریب الوطنی کے محسوسات کا خزانہ بن جاتی ہے [۳۱]

بھیگ چلیں اب رات کی پلکیں
تو اب تھک کر سویا ہوگا

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خاموشی آواز نما کچھ کہتی ہے

شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفان ہے پردہ در خاموش

اردو شاعری کی روایت کے مطابق ''رات'' دیگر شعرا کے یہاں ظلم وتباہی کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے جب کہ ناؔصر کے لیے رات ساتواں در ہے۔ جو ناؔصر کو مایوسی کی کیفیت میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ امید کے دروازے کھولتی ہے۔ ناؔصر کاظمی رات کو دل سے چاہتے ہیں اگر چہ کہ رات ناؔصر کے لیے بھی اذیت کا باعث ہے۔ ناؔصر کاظمی کے نزدیک رات کے سینے میں کئی راز دفن ہیں[۳۲]

کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آرہا ہے

کہاں ہے تو کہ تیرے انتظار میں دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے

ناؔصر کاظمی کے یہاں رات اک مخصوص پیکر بھی ہے۔ ان کے لیے رات دراصل دن کے برابر ہے کیوں کہ عام لوگوں کو رات کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آتا لیکن اس کے برعکس ناؔصر کی آنکھیں ان سناٹوں میں بہت کچھ دیکھ سکتی ہیں اور رات کو ان کی بصری قوت تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناؔصر کاظمی کی شاعری رات کی نئی تشریح وتوضیح پیش کرتی ہے[۳۳]

یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام مجھے
تو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل

بھولی نہیں وہ شام جدائی
میں اس رات بہت رویا تھا

برگ نے، دیوان، نشاطِ خواب، پہلی بارش میں ناصؔر کاظمی کی رات کے بے شمار رنگ پھیلے ہوئے ہیں۔ خاموش گلیاں، سائیں سائیں کرتا شہر، فراق کی راتوں کا انوکھا مزہ، کبھی اکیلا، کبھی ستاروں کی جھرمٹ میں گھرا ہوا چاند وغیرہ غرض ناصؔر کاظمی کی راتوں کا منظر نامہ بہت بھرا پڑا ہے اور ہر ایک کے ساتھ طرح طرح کی کیفیتیں ملتی ہیں۔ ناصؔر کے یہاں رات بجائے خود زندگی ہے اور اس زندگی کے بھید ناصؔر پر رات کی خاموشی اور تنہائی میں کھلتے ہیں۔ چناں چہ اس تعلق سے انتظار حسین کہتے ہیں:

"گریہ ناصؔر کا مسلک نہیں تھا، نہ شاعری میں نہ زندگی میں۔ اس عاشق کا مسلک تھا اداسی اور رت جگا۔ مال روڈ سے پرے بے چراغ سڑک کے کسی فٹ پاتھ پر جاڑوں کے آسمان کے نیچے ایک دیا ٹمٹما رہا ہے اور چائے بن رہی ہے۔۔۔ پچھلی رات کا سارا جادو ناصؔر کی گفتگو میں سمٹ آیا ہے۔ وہ لگاتار بول رہا ہے اور پچھلے پہر کے ڈھائی تین ساتھی دم بہ خود سن رہے ہیں۔۔" [۴۴]

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصؔر
تم نے یہ دولت بیدار کہاں سے پائی

رات اندھیری ہے تو اپنے دھیان کی مشعل جلا
قافلے والوں میں کس کو کس کی پروا ہے نہ پوچھ

کیسی اندھیری رات ہے دیکھو
اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے

اس کے علاوہ ناصؔر کاظمی کی شاعری میں ''شہر'' انسانی اقدار کی پامالی کی علامت بن کر ابھرا ہے ۔

پتھر کا وہ شہر بھی کیا تھا
شہر کے نیچے شہر بسا تھا

پیڑ بھی پتھر پھول بھی پتھر
پتا پتا پتھر کا تھا

لوگ بھی سارے پتھر کے تھے
رنگ ان کا پتھر جیسا تھا

ان تمام اشعار میں پتھر کے شہر کا استعارہ ایک تسلسل سے موجود ہے اور علامتی معنویت کو ابھارتا ہے۔ ایک ایسا شہر جہاں فطری مظاہر بھی پتھر کے ہیں اور لوگ بھی پتھر کے ہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں ''گھر'' کی علامت دراصل دریچوں، دروازوں، آنگن اور دیواروں کے پیکروں کی مدد سے ان کے اس احساس کو پیش کرتا ہے جو تقسیم کے نتیجے میں گھروں کے تباہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ ''گھر'' ذہنی اور جذباتی سکون کی علامت ہے۔ ''گھر'' انسانی رشتوں کی پاکیزگی کی بھی علامت ہے جو شکست وریخت سے دوچار ہے۔ ''گھر'' اس مخصوص تہذیب کے ماحول کا بھی عکاس ہے جو بکھر گیا۔ گھر بچپن کی یادوں کا خزانہ ہے جو لٹ گیا ہے[۳۵]

رات کتنی گزر گئی لیکن
اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

دیوانگیٔ شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

ناصر کے یہاں ''پانی'' بھی ایک کلیدی علامت ہے جو زرخیزی، زندگی، آگہی اور برگشتگی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے[۳۶]

ہاتھ ابھی تک کانپ رہے ہیں
وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا

جسم ابھی تک ٹوٹ رہا ہے
وہ پانی تھا یا لوہا تھا

گہری گہری تیز آنکھوں سے
وہ پانی مجھے دیکھ رہا تھا

کتنا چپ چپ کتنا گم سم
وہ پانی باتیں کرتا تھا

ناصر کاظمی کے یہاں ''صدا'' کی علامت زندگی کی نغمگی، فن، حیات اور عبرت کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے[۳۷] : ع

کتنے ادوار کی گم شدہ نوا
صدائیں آتی ہیں اجڑے ہوئے جزیروں سے

تیری آواز آ رہی ہے ابھی

بلا رہی ہے ابھی تک وہ دل نشین آواز

اس کے علاوہ ان کی شاعری میں ''چاند'' علامتی رنگ اختیار کرتا ہے۔ چاند دراصل تخلیق، رفاقت، حرارت، آگہی اور سکون کی کیفیات کا پتہ دیتا ہے ۔

شب کی تنہائیوں میں پچھلے پہر
چاند کرتا ہے گفتگو ہم سے

پھر چاند کو لے گئیں ہوائیں
پھر بانسری چھیڑ دی صبا نے

رین اندھیری ہے اور کنارہ دور
چاند نکلے تو پار اتر جائیں

ان کے یہاں ''چاند'' صرف علامت یا فطرت کے حوالے سے استعمال نہیں ہوتا بلکہ چاند کے ساتھ ان کی حسین یادیں بھی وابستہ ہیں کیوں کہ چاند ان کے حسین دنوں کا گواہ ہے۔ چاند نے ناصر اور ان کے محبوب کو ایک ساتھ ہم سخن دیکھا۔ مگر اب چاند اور ناصر تو موجود ہیں مگر وہ تیسری شخصیت موجود نہیں ہے لہذا وہ چاند کے ساتھ مل کر ماضی کو یاد کرتے ہیں۔ ۳۸ ؎

اولین چاند نے کیا بات سجھائی مجھ کو
یاد آئی تیری انگشتِ حنائی مجھ کو

ناصر کاظمی کی شاعری میں ''ہوا'' بھی ایک کلیدی علامت ہے۔ ''ہوا'' دراصل وابستگی یاد، آگہی، تباہی اور آرزو کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ۳۹ ؎

دل وحشی لئے جاتا ہے لیکن
ہوا زنجیر سی پہنا رہی ہے

یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں میں
پکارتی ہے ہوا اب کسے کناروں پر

ریگ رواں کی نرم ہستیوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا
سونے صحرا چیخ اٹھتے ہیں آدھی آدھی راتوں کو

ناصرؔ کاظمی کے یہاں ایک مخصوص بنیادی علامت سفر ہے۔ یہ علامت جتنی تواتر کے ساتھ ان کی شاعری میں ملتی ہے شاید ہی کوئی اور علامت ملتی ہو۔ اس علامت کا معنوی انداز جداگانہ ہے جو دل و دماغ کو منور کرتا ہے۔ ''سفر'' دراصل وقت، عمر، تہذیب، نقل وطن، موت، فکر معاش، تکمیل اور عرفان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔[40]

چلے دل سے امیدوں کے مسافر
یہ نگری آج خالی ہو رہی ہے

وہیں رک جائیں گے تاروں کے قدم
ہم جہاں رخت سفر کھولیں گے

''سفر'' ان کے یہاں مختلف موضوعی کیفیات کی تصویر کا نام ہے۔ سفر ایک شعری کردار کے واسطے سے سامنے آتا ہے اور یہ کردار ایک زندہ، منزل ناآشنا مسافر کا کردار ہے۔[41]

مجھ کو اور کہیں جانا تھا
بس یوں ہی رستہ بھول گیا تھا

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غم صد کارواں دیکھا نہ جائے

ناصر کاظمی کا مسافر اپنا منفرد وجود رکھتا ہے۔ ان کا مسافر گھر سے، اپنے وطن سے اس لیے سفر اختیار نہیں کرتا کہ وہ واپس آ جائے گا بلکہ یہ مسافر اپنے گھر بار کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر رخت سفر باندھتا ہے۔ اس کو کہیں بھی وہ منزل نہیں ملتی جو اس کی آنکھوں میں بسی ہے اس سفر میں اس کا کوئی ساتھی بھی نہیں ہے اگر اس کے راستے میں اس کے محبوب کی گلی بھی آ جائے تو وہ ٹھہرنے والا نہیں ہے

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

کیوں کہ انسان کے سفر کو کہیں قرار نہیں وہ آزاد ہے۔ اس سفر میں ناصر ''شہر ستم گر''، ''گم نام برف زاروں''، ''جنگل'' اور ''بھاری رات'' جیسے کڑے مراحل سے گزرتا ہے۔۴۲

چلے چلو انھیں گم نام برف زاروں میں
عجب نہیں ہیں مل جائے درد کا چارا

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منھ اندھیرے

یار کی نگری کوسوں دور
کیسے کٹے گی بھاری رات

ناصر کاظمی کی نظر میں شاعر بھی ایک مسافر ہی ہے چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''ہم لکھنے والے مسافر ہیں، نامعلوم منزلوں کے، مگر ہر

مسافر کی الگ الگ منزل ہے۔ ہم سب تھوڑی دور ایک
دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں اور پگڈنڈی پر بچھڑ جاتے
ہیں اور اکیلے رہ جاتے ہیں اداسی ہماری ہم سفر رہ جاتی
ہیں۔" ۴۳

ناصر کاظمی کے یہاں تنہائی مخصوص علامت میں ملتی ہے۔ جب ان کے تمام ساتھی اپنی اپنی راہیں استوار کر چکے تھے لیکن ناصر حال سے سمجھوتہ کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے اسی لیے ان کے سب ساتھی ناصر کو ان کے حال پر چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ کرب کی اس صورت حال پر وہ بہت زیادہ بے چین ہو جاتے ہیں تب ایسے میں "تنہائی" ان کا ساتھ دیتی ہے اور یہی تنہائی ان کے یہاں ایک کردار بن کر ابھرتی ہے جسے وہ اپنا دوست، غم گسار مانتے رہے ہے۔

چھوڑ گئے جب سارے ساتھی تنہائی نے ساتھ دیا
تنہائی کو کیسے چھوڑیں برسوں سے ایک یار ملا

ناصر کاظمی کے یہاں سایہ اور احساس بھی علامت کے طور پر ملتے ہیں۔ ان کا دوست، غم گسار ایک سایہ ہے جو اس کے احساس کے ساتھ چلتا ہے اور یہی سایہ اور احساس اس کی یاد کے مرکزی کردار بھی ہے جسے وہ "سایۂ گل" کا نام دیتا ہے اور "کچی چاندنی" بھی کہتا ہے۔

میں کیوں نہ پھروں تپتی دوپہروں میں ہراساں
پھرتی ہیں تصور میں کھلے سر تری یادیں

ہجرت کے تعلق سے ناصر کاظمی کی فکر کا محور "یاد" ہے۔ ان کی یاد میں ماضی کی تمام چیزیں محفوظ پڑی ہیں۔ "یاد" دراصل ان کی کھوئی ہوئی دنیا کا محافظ ہے۔

وہ تو کھلنے ہی کو تھا درد محبت کا بھرم
وہ تو کہیے کہ اچانک تیری یاد آئی

''یاد'' ناصر کاظمی کے کئی ایک تجربوں کی کلید ہے۔ یاد دراصل ناصر کے لیے تخلیقی توانائی کا سب سے اہم ماخذ ہے۔ یاد ان کے لیے ان کی داخلی دنیا کے بچاؤ اور اس کی حفاظت کا سب سے طاقتور ذریعہ بھی ہے۔

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھینکا ہوگا

پھر کسی یاد نے کروٹ بدلی
کوئی کانٹا سا چبھا ہے دل میں

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستان میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجہ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے ادھر ادھر کے مجھے

ناصر کاظمی کی شاعری میں علامتیں جتنی شدت سے استعمال ہوئی ہیں اتنی کسی اور کی شاعری میں ملنا مشکل ہے۔

ناصر کاظمی نے پیکر تراشی کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کئی ایک ''images'' کو بروئے کار لایا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری ایک نئی آواز، ایک نئے انداز سے ہم کنار ہوئی۔

ناصر کاظمی حسیات کے شاعر ہیں۔ یہی ان کی غزل کی سب سے بڑی پہچان ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ناصؔر کاظمی نے غزل کی روایت کی توسیع کی اور اپنے اس الگ رنگ کی وجہ سے ممتاز رہے۔

گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میری حدوں سے دور نکل

ناصؔر کاظمی نے نئے اشاروں اور نئی نئی علامتوں کے پیکر تراشے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری کی فضا کافی تبدیل ہوئی۔ ان کے یہاں حیات انسانی کا سوز پایا جاتا ہے جس نے ایک حزنیہ سی کیفیت پیدا کر دی ہے جس کے مطالعہ سے ایک کسک محسوس ہوتی ہے۔ دردمندی کا احساس پایا جاتا ہے۔

کسی بھی تخلیق کا مطالعہ کرنے سے جو کیفیت ظاہر ہوتی ہے خواہ وہ فضا رومانی ہو یا خوش گوار یا سوگوار، قاری جیسے ہی کسی تخلیق کی وادی میں قدم رکھتا ہے وہ مصنف یا شاعر کی وضع کردہ حقیقی فضا سے واقف ہو جاتا ہے۔

ناصؔر کاظمی کی تخیلی فضا کو سمجھنے کے لیے پہلے فضا کے لغوی اور اصطلاحی معانی کو سمجھ لینا چاہئے۔ ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ میں فضا کی تعریف کچھ اس طرح سے ملتی ہے:

''کسی فن پارے سے برانگیخت ہونے والا احساس یا کیفیت یا دوسرے لفظوں میں وہ ناقابل فہم خصوصیت جو ماورائے حس اور حسی ادراک پر اپنا اثر ڈالتی ہے فضا کہلاتی ہے۔''[۴۴]

عتیق اللہ نے فضاء کی تعریف اس انداز سے کی ہے:

''فضاء فن پارے کی اس محیط کیفیت کا نام ہے جسے

زماں، مکاں، مکالمے، بیان اور محل کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔
فضاء کچھ تو محاکات و منظر کشی کے طرز اور کچھ محسوس و
مادی اشیاء کی پیش کش سے تشکیل پاتی ہے اور کچھ فن
پارے کی طبیعی اور نفسیاتی تفصیلات اور قاری کو مہیا کردہ
تاثر اور ساتھ ہی اس کے متوقع جذباتی ردعمل پر مشتمل
ہوتی ہے۔''[۴۵]

صاحب کشافِ تنقیدی اصطلاحات کے الفاظ میں فضا سے مراد یہ ہے:

''وہ عمومی اور مجموعی تاثراتی کیفیت جو کسی عبارت میں
سرایت کیے ہوئے ہو۔ فضا کی تخلیق و تشکیل میں پس
منظر، کردار، عبارت کا مضمون، موضوع کا مزاج اور
نوعیت، الفاظ کا صوتی تاثر، جملوں کا طول، لب ولہجہ،
وزن اور آہنگ وغیرہ بہت سے عوامل مل جل کر حصہ
لیتے ہیں۔''[۴۶]

ناصر کاظمی کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے نہ صرف ان کے تخلیقی شعور کو سمجھنے میں آسانی ہوگی بلکہ ان کی تعین قدر کے مسئلے کو سلجھانے میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔ انھوں نے اپنے شعری عمل کو ''برق خیال'' کے استعارے میں سمویا ہے۔

اے فلک بھیج کوئی برق خیال
کچھ تو شام شب ہجراں چمکے

وہ اپنے علاقے کے سماجی، تہذیبی اور موسمیاتی زندگی کے اثرات کو اپنی روح میں سموتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ موسموں، رنگوں اور آوازوں سے بالکل فطری انداز

میں اثرات قبول کرتے ہیں۔ ان کے مزاج میں دوہے، بھجن، گیت اور لوک کتھاؤں کا حسن، جادو رچ بس گیا۔ وہ مقامی زندگی کے تہواروں، رسوم اور رشتوں سے بہت متاثر تھے ان کی فضا ان کے مزاج سے ہم آہنگ تھی۔ ۷ے

او پچھلی رات کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں

آج تو شہر کی روش روش پر
پتوں کا میلہ سا لگا ہے

ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے
اب اس پیڑ کے پتے جھڑتے جاتے ہیں

۱۹ ویں صدی ۱۹۴۷ء کے بعد تقسیم ہند کے نتیجے میں جو فسادات رونما ہوئے، قدریں پامال ہوئیں، انسان کا انسان دشمن ہوا اس کو ناصرؔ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر ان تمام واقعات کو اپنی تخلیق کا حصہ بنایا۔ اس طرح ذاتی حالات، غم عشق اور غم روزگار نے ان کی شاعری کو ایسا موڑ دیا کہ ان کی شاعری میں دردناک تصویریں نظر آتی ہیں۔

ناصرؔ کاظمی کی شاعری کے تعلق سے گوپی چند نارنگ اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''ناصرؔ کی شاعری تفکر سے عاری لیکن تاثر سے بھرپور ہے۔ ناصرؔ کی پوری شاعری سے ایک مغموم اور تنہا انسان ابھر کر سامنے آتا ہے لیکن اس انسان کی تنہائی کا بہ ظاہر کوئی سبب نظر نہیں آتا بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ

انسان اپنی ذات کے اندر تنہا ہے۔۔۔‘‘ ۴۸؎

جن حالات میں انھوں نے اپنا وطن، گھربار، دوست وغیرہ کو چھوڑ کر نقل وطن پر مجبور ہو گئے تھے اس کا پورا نچوڑ ان کی شاعری میں اُمڈ آیا۔

فلک نے پھینک دیا برگ گل کی چھاؤں سے دور
وہاں پڑے ہیں جہاں خارزار بھی تو نہیں

کچھ اور شعر۔

کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار
بس اے دور زماں دیکھا نہ جائے

تمام عمر جہاں ہنستے کھیلتے گزری
اب اس گلی میں بھی ہم ڈرتے جاتے ہیں

کہاں سے لائیے اب اس نگاہ کو ناصرؔ
جو تمام امنگیں دلوں میں چھوڑ گئی

ناصرؔ کاظمی کو سب سے زیادہ ہجرت کا کرب، تقسیم وطن، فسادات جیسے واقعات نے متاثر کیا اور یہی تجربات آگے چل کر کرب ہجر کا شکار بنا دیتے ہیں جوان کو بھری دنیا میں اکیلا کر دیتے ہیں اور دن کے ہنگاموں میں مگن رہنے سے زیادہ رات کے سناٹے میں مکالمہ کرنے کے لیے اور پناہ لینے کے لیے اکساتے ہیں۔

ناصرؔ ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہیں پرانی باتیں اس کی وہی پرانا راگ

ناصرؔ کاظمی کی ہجرت کے تعلق سے آفتاب احمد لکھتے ہیں:

''ہجرت کے تجربے نے ناصؔر کو اس حد تک اس لیے
متاثر کیا اور اس کے لیے کہ وہ اس کی جان کا روگ بن
گیا اس تجربے میں مقام اور وقت دونوں سے ناصؔر کی
دوری اور اجنبیت کا احساس بہ یک وقت جمع ہو گیا۔
اگلے وقتوں اور پرانی صحبتوں کی یاد ناصؔر کی شاعری کا
اندوختہ بن کر رہ گئی تھیں۔۔۔''۹؎

ناصؔر کاظمی کا جو تخلیقی ذہن تھا وہ دراصل اپنے وطن کو یاد کرتے ہوئے غریب الوطنی میں اس محرومی کا شدت سے احساس کرتا ہے۔ ان کی پوری شاعری ان کے درد کا نچوڑ ہے۔

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں، کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در
یہ وہی دیار ہے دوستو جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

ناصؔر کاظمی کو ماضی بہت عزیز تھا کیوں کہ انھیں غیر منقسم ہندوستان کے اس دیہی ماحول، مخصوص تہذیبی فضا، محبت، ہمدردی، خلوص اور سادگی، رشتوں کا تقدس، عشق کی سچائی، دکھ درد کی میراث اور ان سب سے زیادہ فطرت کا جو قرب تھا جیسے گھاس، جھیل، درخت، رات، خوشبو، کھیت، گگن، شام، تاروں، چاند، ہوا، کرن اور چاندنی کا قرب وغیرہ وغیرہ کو بہت زیادہ یاد کرتے تھے کیوں کہ انھیں یہ فضا دل و جاں سے عزیز تھی اور اس سے بچھڑنے کے غم نے انھیں پریشان کر رکھا۔ اس مخصوص تہذیبی فضا کی بازیافتگی کی وہ آرزو رکھتے تھے لیکن اجنبی شہر میں یہ آرزو انتشار میں بدل گئی اور

وہ گم ہو کہ رہ جاتے ہیں ۔

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

ناصؔر کاظمی ماضی کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں حال سے متعلق وہ تمام احساسات انھیں ماضی کے لمحوں کو تازہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کو پھولوں، لوگوں اور مختلف چیزوں سے جو جذباتی وابستگی پائی جاتی ہے وہ ایک معصوم بچے کی طرح ہے جو میلے میں ماں باپ سے بچھڑ کر ایک پل کے لیے بھی انھیں نہیں بھولتا۔۵۰ ؎

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

کانٹے چھوڑ گئی آندھی
لے گئے اچھے اچھے پھول

ناصؔر کاظمی کے یہاں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو زماں و مکاں کے فاصلوں کی نفی کر کے آفاقی بن جاتے ہیں ۔

تیرے گھر کے دروازے پر
سورج ننگے پاؤں کھڑا تھا

ناصؔر کاظمی دورِ حاضر کی زندگی سے پوری طرح باخبر تھے اور ان سب کو تخلیقی سطح پر برتنا چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ۔

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصؔر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

ناصؔر کی شاعری میں خوف وہراس کی ایک پُراسرار فضا بھی ملتی ہے ۔

جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سرِشام
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تری یادیں

بعض اوقات یہ کیفیت ان پر اس طرح سے حاوی ہو جاتی ہے کہ ان کا پورا ذہن اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور ایسے اشعار نکلتے ہیں جو دل و دماغ کی اس کیفیت کے تاثر کو پیدا کریں۔

آج تو یوں خاموش ہے دنیا
جیسے کچھ ہونے والا ہے

ناؔصر کی شاعری میں جو تخیلی فضا ملتی ہے ان میں سب سے غالب رجحانات میں فسادات کے خلاف ردعمل، تقسیم ہند کے بعد اقدار کی پامالی ماضی کی یاد اور ہجرت کا تجربہ قابل ذکر ہیں انھوں نے اس دور کی زندگی کو پوری طرح محسوس کیا اور اس کا برملا اظہار اپنی شاعری میں کیا۔ ناؔصر کاظمی کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے ان کی تخیلی فضا ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ناؔصر کا کل سرمایہ بچپن سے لے کر عمر کے آخری ایام تک شعوری طور پر حاصل کیے گئے تجربات ہی ہے جن میں ماضی کی یادیں، ہندوستانی کلچر کے ساتھ ساتھ ناکامی عشق بھی ہیں۔ ان کے یہاں محبوب سے بچھڑنے کا دکھ ایک تجربہ و تاثر بن کر ابھرا ہے۔

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

ناؔصر کاظمی کے یہاں زندگی کا احساس پایا جاتا ہے جب پتے جھڑتے ہیں تو ان کا دل روتا ہے۔ ناؔصر قدرت کی ہر شے پر نظر رکھتے ہیں جن میں بوندیں، ابر، بادل، مور، چکور، چاند، ہرن، ریت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ناؔصر اپنی شاعری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

”رات کا جادو میری شاعری کے لیے بہترین نام

ہے۔“[۵۱]

لہٰذا ناصؔر کاظمی کا تخیل فضا پر محیط ہے جب رات کا سناٹا گہرا ہونے لگتا ہے تو اس کا تخیل ساتویں آسماں کی سیر کرنے لگتا ہے اور ذہن سے ایسی ایسی کیفیات کا برملا اظہار ہونے لگتا ہے جسے وہ محسوس کرتا ہے۔

ناصؔر کاظمی کی شاعری ایک مہذب انسان کی شاعری ہے۔ ان کے اشعار میں نئے احساسات پائے جاتے ہیں، نئے جذبات نظر آتے ہیں، ایک نیا شعور بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان سب نے مل کر ان کی شاعری کو نئی نسل کے دل سے نکلی ہوئی آواز بنا دیا ہے۔ یہ ایک ایسی آواز ہے جس میں بے باکی پائی جاتی ہے، جس کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ زخمی ضرور ہے مگر ان میں خودداری اور خوداعتمادی پائی جاتی ہے جو ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔

ناصؔر کی غزل

پاکستان کے قیام کے بعد جن شعرا نے غزل گوئی میں امتیاز حاصل کیا ان میں ناصؔر کاظمی بھی ہیں۔ انھوں نے روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھا اور غم جاناں ہو یا غم دوراں اسے غزل کے مخصوص انداز کا حامل بنایا۔ اس دور میں ان کی غزل حسرت اور جگر کی یاد دلاتی ہے۔ انھوں نے غزل کو توڑنے اور بگاڑنے کے بجائے اسے وسعت عطا کی۔

غزل اپنی زرخیزی اور پوشیدہ امکانات کی بنا پر نئے شاعر کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ردیف، قافیہ، بحر و اوزان اور ایک ایک شعر کے جداگانہ وجود کے باوجود غزل ہیئت کے اعتبار سے لچک رکھتی ہے۔ اس کی علامتیت، نشتریت اور موسیقی اس کی بقا کا سامان تیار کرتی ہے۔ ناصؔر کاظمی ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے غزل ہی کہتے رہے اور اپنی شخصیت کی توانائی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے غزل کے سلسلے میں اپنی انفرادیت پر آنچ تک نہ آنے دی۔ ناصؔر کاظمی نے وہی لکھا جسے انہوں نے سچے دل سے محسوس کیا۔۵۲ چوں کہ ان کے

محسوسات کی نوعیت مختلف رہی ہے اس لیے اس کے اظہار کے لیے غزل ہی بہترین وسیلہ تھی چناں چہ انھیں کسی نئی ہیئت کو وضع کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور غزل ہی میں اپنی کیفیات کا اظہار کرنے لگے۔ ناصر کاظمی غزل کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''غزل میری زندگی ہے اور اسی کی دھن میں دن رات مست رہتا ہوں۔''۵۳

انھوں نے غزل کی پسندیدگی کے دو وجہ بتائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے زیادہ تر غزلیہ شاعری ہی پڑھی ہے پھر دوسری یہ کہ اردو ادب کا بہترین سرمایہ غزل ہی میں موجود ہے اسی لیے انھوں نے نظم کے بجائے غزل کے ذریعہ اپنے تجربات کا اظہار کیا اور نظم کو بالکل چھوڑ دیا۔

ان کی شاعری میں دور جدید کی سرگرمیاں اور تنہائیاں دونوں پائی جاتی ہیں جس میں بیزارگی نہیں ہے بلکہ ایک خواب آگیں کیفیت ہے جس میں حقیقت کا درد آمیز عکس ملتا ہے۔ ان کے تجربے اس قدر حقیقی ہیں کہ اس کی جڑیں زندگی سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں انھوں نے غزل کے روایتی انداز کو بدلنے کی کوشش کی۔ مگر ایسے تجربوں سے گریز کیا جو غزل کی مانوس روایت سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

ناصر کاظمی نے غزل میں ایک خاص تبدیلی یہ کی کہ اسے خالص شعری تجربہ سے واقف کرایا۔ اس لیے یہ کہنا کہ انھوں نے غزل کی کھوئی ہوئی ساخت کی بحالی میں اہم رول ادا کیا، غلط نہیں ہے اور موجودہ دور میں یہ ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا بدل ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

حامدی کاشمیری ناصر کاظمی کی غزلیہ شاعری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ موجودہ صدی میں

> حسرت، فانی، یگانہ اور فراق کے مقابلے میں انھوں
> نے غزل کو ایک نیا تخلیقی موڑ دینے میں نمایاں حصہ ادا
> کیا اور صحیح معنوں میں غزل کی احیاء کی ہے اور کلیم
> الدین احمد کے اس اعتراض کو کہ غزل نیم وحشی صنف
> ہے کھوکھلا ثابت کیا۔''[۵۴]

ناصر کاظمی غزل کے لہجہ سے آشنا ہیں۔ وہ الفاظ کے جوہر شناس ہیں اور شعر میں کسی بھی لفظ کو غیر ضروری استعمال ہونے نہیں دیتے۔ کم سے کم لفظوں میں معنی کو زیادہ سے زیادہ جہتوں میں ابھارنا ان کی فن کاری کا بنیادی وصف ہے۔ یہ اشعار دیکھیے۔

تو نے بنجر زمیں کو پھول دیے
مجھ کو ایک زخم دل کشا ہی دے

رنگ کھلے صحرا کی دھوپ
زلف گھنے جنگل کی رات

ناصر کاظمی کی غزلوں میں میر کے اثرات خاصے گہرے ہیں اور اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ ان اثرات کو قبول کرنے کے بعد وہ بہت آگے بڑھے ہیں یہاں تک کہ اس منزل پر جا پہنچے ہیں جہاں انھیں غزل کی ایک نئی فضا مل گئی ہے۔ اس فضا میں بالکل ایک نیا انداز اور اچھوتا آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی غزلوں میں میر کی طرح اپنی مجموعی فضا کے حوالے سے ہمیں زندگی کے بعض تجربوں کا شعور عطا کرتی ہے اور میر ہی کی طرح ناصر کاظمی کی غزلوں میں احساس اور خیال کی زبردست وحدت ملتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی، ناصر کاظمی کو اوریجنل شاعر مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں ناصر کے کلام میں میر کی جھلک ضرور ملتی ہے مگر اس سے ان کی originality پر کوئی فرق

نہیں پڑتا۔

چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ناصر کاظمی کا اسلوب ایک انتہائی اچھوتا اسلوب تھا۔ اگر اس پر میر کا پرتو ہے تو غالب کا بھی انعکاس ہے۔ میر اور غالب اور ان کے واسطے سے فانی کی جھلک ان کے کلام میں نظر آتی ہے لیکن یہ محض جھلک ہے اس سے زیادہ نہیں مجموعی طور پر اپنے بہترین لمحات میں ناصر کاظمی ہماری غزل کے گنے چنے دو ایک اوریجنل شاعروں میں سے ایک ہیں۔ میر اور فراق کے تازیانے ان کی شاعری پر اس بے دردی سے لگائے گئے کہ ان کا اپنا رنگ پہچان ہی میں نہ آسکا۔''۵۵

ناصر کاظمی کے یہاں مضامین وموضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے اس لیے ان کے یہ تمام اشعار جدت سے پر نظر آتے ہیں ان میں اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے۔

کہاں ہے تو کہ تیرے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے

ناصر کاظمی کی شاعری میں حسن وعشق کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ انھوں نے محبوب کی اداؤں اور عاشق کی کیفیاتِ دلی کو شاعرانہ پیکر عطا کیا ہے۔ ان مضامین میں نئی نسل کا وہ مزاج موجود ہے جو محبوب کی پرستش ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے نام سے کبھی کبھی وحشت بھی ہوتی ہے۔۵۶

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اے دل کسے نصیب یہ توفیق اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصؔر کاظمی نے غزل میں اتنے نئے تجربات کیے ہیں کہ اس کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی۔

تاہم ان کی شاعری کا مزاج اپنے موضوعات و تجربات اور نئے پن کے باوجود روایت سے الگ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں کلاسیکی روایت کی بازیافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس لیے غزل کے تمام پیش روؤں میں ناصؔر کی غزل ایک علاحدہ باب کی حیثیت رکھتی ہے۔[57]

ہم نے بخشی خموشیوں کو زبان
درد مجبور فغاں تھا پہلے

ناصؔر کاظمی کے اشعار میں گلی، شہر، صحرا، چاند، رات، جنگل، دریا وغیرہ نئے مفہوم اور خاص پس منظر میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ناصؔر کاظمی نے کلاسیکیت اور رومانیت کا حسین امتزاج پیش کیا۔ ناصؔر کاظمی کے یہاں اظہار کا جو طریقہ ہے وہ جدید ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کی کلاسیکی اقدار سے قریب ہے۔

ناصؔر کاظمی کی غزل میں روایت کے اثرات تو پائے جاتے ہیں لیکن انھوں نے روایتی انداز میں غزلیں نہیں کہی ہیں بلکہ ان کی غزلیں نئے تجربات کی نشاندہی کرتی ہیں

ان میں ایک نیا لب ولہجہ پایا جاتا ہے۔

ناصؔر کاظمی کی غزلوں میں ایک خاص طرح کی اداس فضا ملتی ہے۔ ان کی غزلیں ایک ایسی دنیا کی خبر دیتی ہیں جو جانی بوجھی بھی ہے اور انجانی بھی۔ یہی کیفیت ناصؔر کاظمی کے رنگ تغزل کی جان ہے۔ دراصل یہ موجودہ عہد کے درد کو بیان کرنے میں کافی قدرت رکھتے ہیں اس لیے ان میں بے حد تازگی پائی جاتی ہے۔ ۵۸

''برگ نے'' کی متعدد غزلوں میں ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے تہذیبی ماحول کی باضابطہ تصویریں ملتی ہیں۔

انھوں نے نئے الفاظ کا استعمال کر کے نہ صرف غزل کے مزاج کو ملحوظ رکھا ہے بلکہ یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ نئی چیزیں قبول کرنا جرم نہیں ہے البتہ ان کو اس طرح سے قبول کریں کہ اپنی چیزوں کو نقصان نہ پہنچے۔

ناصؔر کاظمی نے ہم زمین بحروں میں کئی غزلیں کہی ہیں۔

جادو تھا مینا تھا کیا تھا
میں نے تجھ میں کیا دیکھا تھا

آنکھیں بھی آنکھوں جیسی تھیں
ماتھا بھی ماتھا جیسا تھا

جس مٹی پہ ناز تھا تجھ کو
میں بھی اس مٹی کا بنا تھا

پیپل کا وہ پیڑ پرانا
میرا رستا دیکھ رہا تھا

ناصر کاظمی کی غزلوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس میں ایک داستانوی فضا ملتی ہے جو ان کی تخلیقی فضا کو مستحکم کرتی ہے۔ ناصر کاظمی کو داستان گوئی سے ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے لہذا ایک دفعہ انھوں نے انتظار حسین کے ساتھ مل کر ہمایوں میں داستانیں چھپوانے میں حصہ لیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے شعر گوئی میں بھی داستانوی انداز سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ''نشاط خواب'' جیسی نظم داستان ہی میں ترتیب دی۔ ۵۹؎

سچ مچ کا اک مکاں پرستاں کہیں جسے
رہتی تھی اس میں ایک پری زاد پدمنی

اونچی کھلیں، فصیلیں، فصیلوں پہ برجیاں
دیواریں سنگ سرخ کی دروازے ہے چندنی

جھل جھل رہے تھے پس چادر غبار
خیمے شفق سے لال چتر تخت کندنی

نئے اشاروں اور نئی علامتوں نے ان کی غزل کو ایک نئی فضا سے متعارف کرایا۔ ان کی غزلوں میں امیجری بالکل نئی اور اچھوتی ہے۔ ان کی غزل میں تکلف اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا کیوں کہ وہ ایک پرخلوص اور سادہ انسان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔

ناصر کاظمی نے غزل کی دشمنی کے زمانے میں غزل کو آورد سے پاک وصاف کر کے دراصل اس کے فطری حسن کی طرف توجہ کی جو ان کا سب سے اہم کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

ناصر کاظمی کے معاصرین میں مجید امجد، احمد مشتاق، شہزاد احمد، منیر نیازی، ظفر

اقبال، محسن احسان، وزیر آغا، ساقی فاروقی، ابن انشاء، شکیب جلالی، سلیم احمد، اطہر نفیس، ریاض مجید، افتخار عارف، پروین شاکر، شیر افضل جعفری، جمیل ملک، جعفر شیرازی، باقر رضوی، انور شعور اور ناصر شہزاد وغیرہ نے غزل کی روایت کی تشکیل نو میں حصہ لیا۔[۶۰]

غزل کا لہجہ

ناصر کاظمی کی غزل کے لہجہ کا خاص وصف ان کی انفرادیت ہے گو کہ ان پر کلاسیکی رنگ غالب تھا لیکن پھر بھی ان کی انفرادیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یہ انفرادیت انھیں ان کے مخصوص اسلوب، خوبصورت اور مؤثر الفاظ کے استعمال، چھوٹی بحروں کے انتخاب اور دلکش تراکیب سے حاصل ہوئی ہے ان کی اسی انفرادیت کے عوض کہا جاتا ہے کہ پاکستانی غزل کو کوئی ایسا شاعر گزشتہ بیس پچیس برسوں میں نہیں مل سکتا تھا۔[۶۱]

ناصر کاظمی کی غزل کا لہجہ اپنے محسوسات کا سیدھا سادہ بیان ہے۔ اسی بیان کے ذریعہ انھوں نے غزل کا رخ موڑا۔ اُن کی غزل کے بعد غزل کا لہجہ بدلنا شروع ہوا۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ وہ غزل کو پس منظر سے پیش منظر میں لے آئے۔

ناصر کاظمی کی غزل کا رنگ ہلکا پھلکا سا ہے۔ ان کو اپنے محبوب سے جو وابستگی ہے اُس کا اظہار، اس غزل میں نہایت عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔ غزل کے چند اشعار ؂

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے

جس دھوپ کی دل میں ٹھنڈک تھی وہ دھوپ اسی کے ساتھ گئی
ان جلتی ابلتی گلیوں میں اب خاک اڑاؤں کس کے لیے

وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لیے

جہاں تک لہجہ کا تعلق ہے ناصؔر کاظمی کا لہجہ عام غزلوں سے مختلف ہے۔ ''برگ نے'' کی بہ طور خاص وہ غزلیں جن کا حوالہ تقسیم کے ساتھ ہونے والے فسادات ہیں، اُس میں اُن کا لہجہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اس لہجہ میں احتجاج اور غصے کی لے خاصی اونچی ہے۔ اداسی اور غنائیت کا تاثر دبا دبا سا ہے، ان غزلوں میں مجرد خیالات کا بیان ہے، اس کے علاوہ پیکر کا استعمال بھی نہایت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

ناصؔر کاظمی کی غزل، دراصل نئی نسل کے نوجوان غزل گو شعرا کی نمائندگی کرتی ہیں اسی لیے غزل کی روایت میں ان کی آواز بالکل نئی ہے جو اُن کی غزل کا خصوصی وصف ہے۔

غزل کے لہجے کو اور زیادہ نجی اور زیادہ نرم و نازک بنانے کی کوشش میں کوئی ہندوستانی شاعر نے اتنی مقبولیت حاصل نہیں کی ہے جتنی ناصؔر کاظمی کے حصہ میں آئی ہے۔

غزل کا اسلوب

ناصؔر کاظمی خداداد صلاحیت کے مالک تھے اُن کا اسلوب جداگانہ نوعیت کا حامل ہے اور جاذبیت بھی رکھتا ہے۔ اُن کے یہاں ایسی بصیرت پائی جاتی ہے جو زندگی کی سچائیوں اور خوبصورتیوں سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور عجلت کے ساتھ لفظ کو پیکر میں تبدیل کرتا ہے۔ ناصؔر کے اسلوب کا یہ انداز ذہنی اختراع اور لہجے کی شادابی کو ظاہر کرتا

ہے۔ اتنا ہی نہیں ان کے مزاج میں رچی بسی اداسی ان کے اسلوب کو نئے ذائقہ سے آشنا کراتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کا اسلوب سادگی، خلوص، بے ساختگی اور تازگی سے ممیز ہو جاتا ہے[62]

یوں پریشان ہوئیں تری یادیں
جیسے اوراق گل بکھر جائیں

ناصؔر کاظمی نے اپنے عہد کے انتشار کا ذکر ایک ایسے اسلوب میں کیا ہے جو نرم اور دھیما ہے۔ ''برگ نے'' میں تقسیم اور فسادات کے موضوع پر پوری کی پوری غزلیں موجود ہیں۔ ان غزلوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں جس تجربے کو موضوع بنایا گیا ہے وہ ناصؔر کے احساس کو متحرک کرتا ہے جسے ہم بھی محسوس کر سکتے ہیں۔

ناصؔر کاظمی نے میؔر کے اسلوب سے استفادہ کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ میؔر کا زمانہ رات تھا اور یہ رات ہمارے عہد کی رات سے آملتی ہے۔

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں فراقؔ کے اسلوب کا اثر بھی واضح طور پر پایا جاتا ہے۔ ''پہلی بارش'' کی غزلوں کا لہجہ، فراقؔ کے لہجے کی یاد دلاتا ہے اس کے علاوہ ناصؔر کے یہاں فراقؔ کے بہت سے نمائندہ اشعار کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مثلاً: فراقؔ ؎

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشیں بے جا بھی نہیں

ناصؔر کاظمی ؎

وہ دوستی تو خیر اب نصیب دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

اگر ناصؔر کاظمی کے کلام میں میؔر کا پرتو ہے تو غالبؔ کا بھی عکس نظر آتا ہے۔ میؔر،

غالبؔ اور فراقؔ کے علاوہ فانیؔ کے کلام کی جھلک بھی کہیں کہیں ان کے کلام میں نظر آتی ہے۔

ناصرؔ کاظمی کو امتیاز دراصل ان کے اسلوب کی وجہ سے حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے اسلوب کو انتہائی شگفتہ بنایا تاکہ اس سے ذہن مکدر نہ ہو بلکہ تصوراتِ آئینہ بن جائیں۔

الغرض ناصرؔ کاظمی حد درجہ جذباتی ہونے کے باوجود سلیقہ، صبر و تحمل اور توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اسی لیے ان کے اشعار ہیئت کے اعتبار سے نفاست، توازن اور تازگی بخشتے ہیں۔

ناصرؔ کاظمی نے کلام میں اہم شعرا کی آواز روپوش ہے مگر مختلف انداز میں:

دیوانگیٔ شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے درو دیوار سا بھی ہو

یہ شعر غالبؔ کے فکر کی غمازی کرتا ہے۔

نئی نسل کا نوجوان اپنے عہد میں جن حالات سے گزر رہا ہے، جو مسائل اسے درپیش آرہے ہیں اور ان سب کے نتیجے میں ان پر کیا بیت رہی ہے اس کی سچی تصویر ناصرؔ کاظمی کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ ناصرؔ کاظمی نے غزل کو روزمرہ کی زبان سے قریب کیا اور انھوں نے اپنی شاعری میں جن علامتوں کا استعمال کیا ہے اس کا تعلق بھی فطری ماحول یا روزمرہ کی زندگی سے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تقسیم ہند کے بعد کے حالات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور اس میں ذاتی نرمی، افسردگی اور محرومی کی کیفیت شامل کی لہٰذا اس بنا پر وہ نئی غزل کے پیش رو کہلائے۔

جدید شعرا کے پیش رو شعرا میں منیرؔ نیازی، ناصرؔ کاظمی، ابن انشاؔ اور عزیزؔ حامد مدنیؔ وغیرہ نے اپنے پیش روؤں سے مختلف انداز میں غزلیں کہیں جس کا انداز نیا ہونے کے ساتھ ساتھ جدید شعرا کی کہی ہوئی غزلیات سے بھی مختلف ہے۔

الغرض ناصرؔ کاظمی اردو ادب کے ایک بڑے شاعر گزرے ہیں ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ان کی شاعری اور شخصیت سے لگایا جا سکتا ہے۔

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفل سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشان رہے گا

حوالے

۱۔ قمر رئیس، معاصر اردو غزل، ۱۸۶ تا ۱۸۷

۲۔ حامدی کاشمیری، ناصر کاظمی کی شاعری، ص: ۴۳، ۴۴

۳۔ ایضاً، ص: ۴۳

۴۔ ناصر کاظمی، ناصر کاظمی کی ڈائری، ص ۱۸، ۵۸

۵۔ ناصر کاظمی۔ ناصر کاظمی کی ڈائری، ص: ۶۵، ۶۶

۶۔ شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی، ایک ھیان، ص ۲۶

۷۔ حامدی کاشمیری، جدید شعری منتظر نامہ، ص ۶۱

۸۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص: ۷۹

۹۔ علی جاوید۔ فکر و تحقیق، ص: ۸۴

۱۰۔ عبادت بریلوی، جدید شاعری، ص: ۴۰۹، ۴۱۰

۱۱۔ وہاب اشرفی، تاریخ ادب اردو، ص: ۱۵۶۱

۱۲۔ محمد جعفر، اردو میں غزل......، ص: ۳۴۱

۱۳۔ ناصر کاظمی۔ چند پریشان کاغذات، ص: ۷۲

۱۴۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۸۳

۱۵۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۸۴

۱۶۔ کامل قریشی، اردو غزل، ص:۳۴۱

۱۷۔ ساجد امجد، اردو شاعری پر.....، ص:۵۱۳

۱۸۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۸۵

۱۹۔ محمد ارشد، خبر نامہ، ص:۱۶

۲۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ اثبات ونفی، ص:۱۳۶، ۱۳۷

۲۱۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۶۰

۲۲۔ علی جاوید۔ فکر و تحقیق، ص:۱۱۴

۲۳۔ حامدی کاشمیری، ناصر کاظمی کی شاعری، ص:۲۴، ۲۵

۲۴۔ امتیاز بلوچ۔ حاصل مطالعہ، ص:۲۵

۲۵۔ صلاح الدین۔ ناصر کاظمی۔ ایک دھیان

۲۶۔ علی جاوید۔ فکر و تحقیق، ص:۱۱۵

۲۷۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ

۲۸۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۶۶

۲۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ اثبات ونفی، ص:۱۵۹

۳۰۔ ناصر کاظمی۔ ناصر کاظمی کی ڈائری، ص:۷۷

۳۱۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۶۸

۳۲۔ امتیاز بلوچ۔ حاصل مطالعہ، ص:۴۱

۳۳۔ ایضاً، ص:۴۱

۳۴۔ علی جاوید۔ فکر و تحقیق، ص:۱۰۰، ۱۰۱

۳۵۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۶۹

۳۶۔ ایضاً، ص:۷۰

۳۷۔ ایضاً، ص:۷۰

۳۸۔ امتیاز بلوچ، حاصل مطالعہ، ص:۴۰

۳۹۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۷۰

۴۰۔ ایضاً، ص:۷۰

۴۱۔ ایضاً، ص:۷۰

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ ایضاً، ص:۷۳

۴۴۔ عتیق اللہ۔ ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، ص:۲۶۸

۴۵۔ ایضاً، ص:۲۶۸

۴۶۔ ایضاً، ص:۲۶۹

۴۷۔ حامدی کاشمیری، ناصر کاظمی کی شاعری، ص:۴۰، ۴۱

۴۸۔ گوپی چند نارنگ۔ بیسویں صدی میں اردو ادب، ص:۶۴

۴۹۔ امتیاز بلوچ، حاصل مطالعہ، ص:۳۸

۵۰۔ حامدی کاشمیری، ناصر کاظمی کی شاعری، ص:۴۸

۵۱۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص:۲۵

۵۲۔ حامدی کاشمیری، ناصر کاظمی کی شاعری، ص:۶۱

۵۳۔ ناصر کاظمی، چند پریشان کاغذ، ص:۲۳

۵۴۔ حامدی کاشمیری، جدید شعری منظر نامہ، ص: ۶۰

۵۵۔ ممتاز الحق۔ جدید غزل کا فنی، سیاسی و سماجی مطالعہ، ص: ۱۲۵

۵۶۔ عبادت بریلوی، جدید شاعری، ص: ۴۰۴

۵۷۔ کامل قریشی، اردو غزل، ص: ۳۵

۵۸۔ خورشید عالم، اردو شاعری: انتخاب، ص: ۱۴۴

۵۹۔ حامدی کاشمیری، ناصر کاظمی کی شاعری، ص: ۳۰

۶۰۔ ممتاز الحق، جدید غزل کا فنی....، ۱۱۴، ۱۱۵

۶۱۔ معین الدین، پاکستان میں اردو غزل، ص: ۲۹

۶۲۔ حامدی کاشمیری، ناصر کاظمی کی شاعری، ص: ۶۲

باب سوم

ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر تراشی

پیکر کے لغوی معنی ''شکل وصورت'' کے ہیں۔ اردو میں یہ انگریزی اصطلاح ''Image'' کے متبادل رائج ہے جو لاطینی لفظ ''Imago'' سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی ''نقل کرنے'' کے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے ''تمثال'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

اعجاز اللغات میں پیکر کی تعریف اس طرح درج ہے:

''چہرہ، شکل، صورت وغیرہ۔''[1]

اس کے علاوہ اردو کی مستند و معتبر لغات میں ''پیکر'' کے معنی کچھ اس طرح دیے گئے ہیں:

''مورت، شبیہ، بت، عکس، ہو بہو تصویر، خیالی تصویر،
تصویر کھینچ دینا، مثالی پیکر ہونا، صورت بنانا، تصویر بنانا
وغیرہ۔''[2]

بالفاظ دیگر کوئی خیالی تصویر جب شاعری میں استعمال ہوتی ہے تو پیکر کہلاتی ہے۔
آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری میں Imagery کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

''خیالی تصویر، بالخصوص استعارات، ذہنی نقوش، مجسمہ طرازی، نقش گری۔''[۳]

پیکر کے اصلی معنی ''شکل وصورت'' کے ہیں الیکس پر منگر نے لکھا ہے:

''ایک طبعی نظر سے ذہن پر کسی حسی کیفیت کی از سر نو نمود پیکر ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص کوئی مخصوص رنگ دیکھتا ہے تو اس کے ذہن پر اس رنگ کا پیکر بن جاتا ہے اس لیے کہ جس داخلی حسی کیفیت کا وہ تجربہ کرتا ہے وہ خارجی رنگ کی ہو بہو شکل ہوتی ہے یا اس کی نقل ہوتی ہے۔ ذہن ایسے پیکر بھی تشکیل دے سکتا ہے جن کا تعلق براہ راست طبعی نظر سے نہ ہو مثلاً اس بات کی کوشش کی کہ وہ چیز یاد آ جائے جو کبھی نظر میں تھی لیکن اب ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔۔۔ وہ تخیل میں لائی جائیں۔۔۔''[۴]

تمام تعریفوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پیکر کے لغوی معنی قریب قریب ایک ہی ہیں۔ ان میں معمولی سا فرق پایا جاتا ہے۔ لہذا پیکر کے لغوی معنی ''شکل وصورت یا خیالی تصویر'' کے ہیں یعنی ایک ایسی تصویر جسے شاعر اپنے ذہن سے تراشتا ہے پیکر کہلاتا ہے۔

امیجری ایک انگریزی اصطلاح ہے جس کے معنی ''Collective images'' کے ہیں۔

امریکن انسائیکلوپیڈیا میں امیجری کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''ادبی تنقید میں امیجری کا مطلب ہوتا ہے تصنیف میں
مجموعی پیکر Collective images (مخصوص قسم
کے صنائع بدائع)۔۔۔ اپنی ایک ابتدائی Earliest
صورت میں لفظ Image کے معنی ہوئے آدمی یا کسی
شے کی مجرد شکل میں تصویر جو عموماً تراشیدہ۔۔۔ یا ڈھلی
ہوئی۔۔۔ ہو اپنے سب سے زیادہ مدلل و منطقی۔۔۔
مفہوم میں بھی Images اپنے بنیادی معنی ''اس شے
کی مجرد تصویر پر جو حسیات سے باہر ہو قائم رکھتی
ہے۔۔۔ لہذا یہ نہ صرف زیورات بلکہ تصنیف کے
مفہوم۔۔۔ کے لیے بھی ضروری ہے۔''[۵]

انسائیکلوپیڈیا آف پوئٹری اینڈ پوئٹکس میں ''امیجری'' کی تعریف اس طرح ملتی
ہے:

"An image is the reproduction in the mind of a sensation produced by a Physical perception. Thus if a man's eye perceives a certain color, he will register an image of that color in his mind - "image" because subjective sensation he experiences will be an ostensible

copy or preplica of the objective color itself. The mind may also produce images when not reflecting direct physical preception, as in the attempt to remember something once perceived but no longer present., or in the undirected drifting of the mind over experience, or in the combination wrought out of perception by the imagination, or in the hallucination of dream and fever and so on." ٦

(امیج یا پیکر ذہن میں اس احساس کی باز آفرینی کا نام ہے جو کسی بصری ادراک کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جس طرح انسان کی آنکھ جب کسی رنگ کو دیکھتی ہے تو وہ اس رنگ کی ایک تصویر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے یعنی پیکر کیوں کہ جس داخلی احساس کا وہ ادراک کرتا ہے یا تو اس خارجی رنگ کی تقریباً نقل ہوگی یا ہو بہو تصویر۔ ذہنی پیکروں کی باز آفرینی اس وقت بھی کر سکتا

ہے جب کہ براہ راست وہ بصری ادراک نہ کر رہا ہو۔
مثلاً کبھی کی دیکھی ہوئی کسی چیز کو یاد کرنے کی کوشش جو
سامنے نہ ہو (یا موجود نہ ہو) یا ذہن کا کسی تجربے کی
طرف غیر ارادی طور پر پھیل جانا، یا ان بصری مرکبات
کے طور پر جن کو تصور نے بنایا ہو، یا ان واہموں کی شکل
میں جو خواب یا بخار کی ہذیانی کیفیت میں پیدا ہوتے
ہیں۔)

اردو ادب میں پیکر کی جھلک ''وصف''، ''مصوری'' اور ''محاکات'' کی تعریفوں میں نظر آتی ہے۔

''وصف'' کی تعریف یہ ہے کہ وہ صورت کی ہو بہو تصویر پیش کریں۔ لہٰذا اس تعریف میں کسی قدر پیکر کی تعریف کی جھلک ملتی ہے۔[7]

''شاعرانہ مصوری'' کی تعریف یہ ہے کہ شاعری دراصل مصوری ہے اس میں مصوری اور شاعری کو ایک دوسرے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی تعریف پیکر کے مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔[8]

''محاکات'' یعنی کسی چیز، حالت یا حالات کا اس طرح ادا کرنا کہ اس شئے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔[9]

محاکات کی تعریف، وصف اور مصوری کے مقابل میں پیکر سے زیادہ قریب ہے لیکن اس کے باوجود اردو کی کوئی پرانی اصطلاح پیکر کے مفہوم کو صحیح ادا نہیں کرتی۔

پیکر کی اصطلاح ان معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے کہ پیکر صرف ایک ذہنی تصویر ہی نہیں بلکہ تخلیقی تجربے کے حسی ادراک سے عبارت ہے جو نہ صرف اشیا وغیرہ کا

اظہار کرتی ہے بلکہ خیالات، افکار اور تصورات وغیرہ کو ٹھوس اور حسی شکل میں پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔[10]

پیکر تراشی دراصل اس دور کی تنقید کا نیا طریقہ کار ہے اور اسے مغربی دنیا کی دین سمجھا جاتا ہے لیکن تحقیق کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ فنی نکتہ عالم مشرق کے لیے نام کے اعتبار سے بھلے ہی نیا ہو مگر موضوع کے اعتبار سے اجنبی نہیں۔ اس کا طریقہ کار یقیناً ہمارے شعر و ادب کے لیے انوکھا اور بالکل نیا ہے۔[11]

اردو ادب میں تخیل، محاکات، استعارے، تشبیہات، اشارہ، کنایہ اور مجاز مرسل وغیرہ کے علاوہ اور بھی کئی شعری تکنیکوں کا مطالعہ کیا جاتا رہا ہے جو کسی نہ کسی طرح اس نئی اصطلاح ''امیجری'' ہی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ جس کا نام بھلے ہی نیا ہو مگر فن کافی پرانا ہے۔

چوں کہ شاعر کا مشاہدہ و مطالعہ بے حد وسیع ہوتا ہے اور اُس کے ذریعہ شاعر کو جو عقلی و حسی تجربات ہوتے ہیں تخیل ان کو ضرورت کے مطابق تبدیلی کرتے ہوئے ایسے تخیلی پیکر تراشتا ہے جو حقیقی نہ ہوتے ہوئے بھی حسی پیکروں سے زیادہ دلکش اور بامعنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے اصطلاحِ نقد میں اس عمل کو پیکر تراشی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا لغوی و اصطلاحی معنوں کے مطالعہ سے پیکر تراشی کے فن کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور قاری اس فن کے معنوں سے بہ خوبی واقف ہو جاتا ہے۔

پیکر، دراصل، شعر کے فن میں زبان کا ایسا اہم عنصر ہے جس کے ذریعہ کوئی بھی تخلیق اپنی آب و تاب کے ساتھ ابلاغ کے مراحل سے گزرتی ہے۔ اسی لیے پیکر، تشبیہ، استعارہ یا محاکات کی طرح صرف شعر کی سجاوٹ نہیں کرتا بلکہ شعر کے مفہوم کو سمجھنے میں اہم رول انجام دیتا ہے۔

چوں کہ ادب اور آرٹ کا اہم مقصد تجربے کا اظہار اور ترسیل ہے۔ لہذا یہ کام پیکر تراشی کے ذریعہ بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا جاسکتا ہے۔ ایک اور نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو فن کی ترسیل پیکر تراشی کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی کے مطابق ۱۲؎ پیکر کے دو مفہوم مقبول عام وخواص ہے ایک نفسیاتی و تجریدی اور دوسرا لسانی ہے۔ پہلے مفہوم کا تعلق تصور، عکس اور ذہنی شبیہ سے ہوتا ہے جب کہ دوسرے مفہوم میں پیکر کو زبان کی مختلف شکلوں یعنی تشبیہ، استعارہ اور لفظی تصویر وغیرہ تصور کیا جاتا ہے۔ پیکر کا پہلا مفہوم نفسیات اور دوسرا ادب سے قریب تر ہے۔ پیکر کی جامع تعریف ان دونوں کے امتزاج کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کا تفصیلی جائزہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

نفسیاتی پیکر

نفسیاتی پیکر دراصل قدرتی دریافت کی تخلیق جدید ہے جو جذبات کے لمحات میں ذہن میں ابھرتا ہے یعنی اگر کوئی شخص کسی خاص رنگ کو دیکھتا ہے تو وہ اس کا ایک خاص پیکر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ پیکر صرف قوت باصرہ کے ذریعہ ہی دماغ میں نہیں ابھرتا بلکہ حواس خمسہ کے ذریعہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ بسا اوقات پیکر قدرتی دریافت کے بغیر بھی ذہن میں نمودار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

i۔ ایک ایسی چیز جو بہت پہلے دیکھی ہو اور وہ فی الوقت سامنے موجود نہ ہو بلکہ صرف یادداشت کی بنا پر ذہن میں موجود ہو تو ایک پیکر کی تخلیق ہوتی ہے۔ ایسے پیکروں کا تعلق ماضی کی یادداشت سے ہوتا ہے لہذا یہ

یادداشتی پیکر کہلاتے ہیں۔

ii۔ بعض اوقات ذہن کسی خاص تجربے کی جانب مرکوز رہتا ہے اور اسی کے پیکر تراشتا رہتا ہے۔

iii۔ تخیل کے ذریعہ ادراک کے نئے مرکبات بنتے رہتے ہیں اور ان مرکبات سے نئے نئے پیکر ابھرتے رہتے ہیں۔

iv۔ خواب کے عالم میں بھی ذہن پیکر تراشی کا عمل کرتا ہے۔

v۔ بخار کے عالم میں ذہن پیکر تراشی کے نیم شعوری عمل سے گزرتا ہے۔

لسانیاتی پیکر

لسانیاتی پیکر، ان پیکروں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو زبان اور اس کی مختلف شکلوں کے ذریعہ سے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ پیکر صرف ذہنی پیکر، حواس خمسہ یا دیگر نفسیاتی ردعمل یا فطری کیفیات سے ذہن میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ اس میں خیال کے مرکبات اور الفاظ کی وہ تمام صورتیں موجود ہیں جو پیکر تراشی کی تشکیل میں مدد دیتی ہیں۔ پیکر تراشی کے تعلق سے ڈاکٹر عنوان چشتی فرماتے ہیں:

> ''پیکر سازی کا عمل انسانی ذہن کا فطری عمل ہے اس لیے ہر شخص عموماً اور فن کار خصوصاً حسی ادراک کو ذہنی پیکروں میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ انسان کے ذہن میں پیکروں کی تخلیق محض حواس خمسہ کی مدد سے ہی نہیں ہوتی بلکہ دوسرے ذریعوں

سے بھی ہوتی ہے ۔۔۔ لسانی پیکریت میں وہ تمام
شکلیں شامل ہیں جو لفظی پیکروں کی شکل میں نمودار
ہوتی ہیں۔ ذہنی پیکروں کو لفظی پیکروں میں بدلنا ہی
پیکر تراشی کا کمال ہے۔''[۱۳]

پیکر تراشی پر سب سے پہلے جس انگریزی مصنفہ نے قلم اٹھایا ہے وہ مس کیرولین اسپرجین ہے۔ یہ پہلی مستند شخصیت ہے جس نے پیکر تراشی کو سمجھا اور سمجھایا۔ انھوں نے شیکسپیئر کی امیجری پر ایک مستند کتاب تصنیف کی جس کا نام '' Shakespeares Imagery and What It Tells Us '' ہے۔ پیکر تراشی سے متعلق مس اسپرجین نے جتنے بھی خیالات بیان کیے ہیں سبھی ناقدین اور مصنفین اس سے متفق ہیں۔

مس اسپرجین نے پیکر کی تعریف کو بہت مشکل کام بتایا ہے لیکن اس کے باوجود وہ پیکر کی تعریف ان لفظوں میں کرتی ہے:

''۔۔۔ یہ Image شاعر یا نثر نگار کے اپنے خیالات
کو مشرح اجاگر اور مزین کرنے کے لیے استعمال شدہ
لفظی تصویر word picture ہے۔ یہ ایک مذکور یا
مفہوم بیان یا خیال ہے جو کسی چیز کے موازنہ یا
مماثلت کے ذریعہ تمام گہری اور اعلیٰ شاعری اور شاعر
کے کل نظریات جو وہ سوچتا اور محسوس کر چکا ہے اور جن
سے وہ ہمیں آگاہ کر رہا ہے کا بیدار شدہ جذبات کے
توسط سے کچھ حصہ پیش کرتی ہے۔''[۱۴]

لفظی تصویر کی مثال اس طرح ہے کہ جب کوئی شخص آسمان میں تیز روشنی کو چمک

دمک کے ساتھ دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں اس چمک کا نقش بیٹھ جاتا ہے اور جب وہ اس نقش کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو اس کی تصویر کشی الفاظ کے وسیلے سے کرتا ہے یعنی اس چمکیلی شے کو ''بجلی'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اس طرح وہ ذہنی تصویر، لفظی تصویر میں تبدیل ہو جاتی ہے لہذا لسانی نقطہ نظر سے اس تصویر کو ''پیکر'' کہتے ہیں۔

سی۔ ڈی۔ لیوس نے پیکر کے متعلق لکھا ہے:

''یہ لفظوں سے تصویر بنانے کا عمل ہے۔'' ۱۵

جب کہ حامدی کاشمیری پیکر کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''پیکر دراصل داخلی اور محسوساتی تجربات کی مصورانہ پیش کش کا کام کرتا ہے۔'' ۱۶

اس کے برخلاف ازراپاونڈ لکھتے ہیں:

''پیکر تصویری نقل نہیں ہے بلکہ وہ شے ہے جو کسی عقلی اور جذباتی کامپلکس کو وقت کے ایک لمحے میں پیش کر دیتا ہے۔'' ۱۷

پیکر دراصل ذہنی قوت میں اضافہ کرتی ہے اس کے علاوہ اس کے اثرات طبعی ہوتے ہیں۔

Sir Philip Sidney نے اپنے ایک مضمون ''Defence of Poesie'' میں پیکر کے تعلق سے لکھا ہے:

"Imagining is in itself the very height and life of poetry." ۱۸

یعنی پیکر یا تصویر بہ ذات خود شاعری کی معراج اور اس کی روح ہے۔

شاعری دراصل نظریہ سے نہیں بلکہ زندگی سے تقویت پاتی ہے اور احساسات کا اظہار بھی کامیاب شعری پیکروں میں ہوتا ہے۔ امیجری دراصل شاعر کے ذہنی خیالات و احساسات کا شعوری و لاشعوری تجربات کا وہ انکشاف ہے جو علم بیان کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ کلام میں دلکشی و اثر انگیزی پائی جاتی ہے۔ ۱۹

انسان کے جو بھی احساسات ہیں وہ فطری طور پر مختلف انداز میں سامنے آتے ہیں جو نئے واقعات کا حاصل ہے۔ لہذا اسی سے نئی علامتیں اور نئی امیجری وجود میں آتی ہے۔

کس سے ملیں کہاں جائیں کہ رات کالی ہے
وہ شکل ہی نہ رہی جو دیے جلاتی تھی

حسی پیکر کے تعلق سے Miss Dawney کا خیال ہے:

''پیکر کو محض مادی یا مادی تصویر کی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس کو ایسے خیال کے مواد کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے جس میں ایک قسم کی حسی خصوصیت ہوتی ہو۔'' ۲۰

رابرٹ سیکلٹن نے ''Poetic Image'' میں Image کی تعریف اس طرح بیان کی ہے:

"An image is a word arouses ideas of sensory perception." ۲۱

یعنی پیکر ایک لفظ ہے جو حسی عینیت (اصل حقیقت) سے خیالات کو پیدا کرتا ہے۔

پیکر تراشی کے تعلق سے ینگ نے بہت خوب لکھا ہے:

''پیکر تخیل کی تخلیقی قوت سے تشکیل پانے والا، نفسی قوت اظہار کا مخصوص طریقہ اظہار ہے۔''۲۲

انسان پیکروں میں سوچتا ہے۔ ذہنی پیکر ارادی طور پر بنائے نہیں جاتے یہ خود بہ خود ذہن میں آ موجود ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق سوچنے والے کے ماضی کے تجربات سے ہوتا ہے۔ مثلاً

میرے پیچھے جانے والے کل کا دھندلکا
ایسی شکلیں جن کے نقش ہوا پر جیسے تحریریں ہوں
ایسے قصے جن کے دامن پر سایوں کی تصویریں ہوں
(قیوم نظر)

یہاں شاعر نے ماضی کو دھندلکا اور اس کے تاثرات کو ہوا کے نقوش اور سایوں کو تصویروں کے پیکروں سے ظاہر کیا ہے۔

پیکر تراشی یادوں اور تجربوں کی ذہنی اور محسوساتی پیچیدگی کو اشیا اور مناظر کے وسیلے سے پیش کرنے کا نام ہے۔ ایسے پیکر جو خارجی دنیا سے مطابقت رکھتے ہوئے ذہن و دل کی عجیب و غریب دنیا کو پیش کرتے ہیں پیکر کہلاتے ہیں۔ انیس اشفاق نے پیکر کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''پیکر سے مراد ظاہری مادی محسوسات کے نقش کو ذہن میں ازسرنو خلق کرنا ہے۔''۲۳

یعنی ایسا نقش جس کا تعلق راست طور پر حواس خمسہ سے اور تخیل سے ہوتا ہے۔
پیکر حسی تجربے کا لفظی اور شعری اظہار ہے جو حواس خمسہ میں سے کسی ایک سے

زیادہ حواس کو متاثر کرے۔ یہ تاثر ایسا ہو کہ شعر میں موجود الفاظ سے بننے والی تصویروں کے ذریعہ احساس اور ادراک کی سطحوں تک پہنچے۔[۲۴]

پیکر تراشی حواس خمسہ کو بیدار کرتی ہے اور انھیں متحرک بھی۔ چوں کہ ہمارے حواس خمسہ ہر وقت بیدار نہیں رہتے لیکن جب کوئی خاص مقصد ان کے سامنے آجاتا ہے تو پھر بھولی بسری یادیں خود بہ خود تازہ ہو جاتی ہیں اور اس مقصد کی وجہ سے ہمارے حواس خمسہ بھی متحرک ہو جاتے ہیں اور وہ تمام باتیں اپنی تمام تر تصویروں کے ساتھ نہ صرف نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں بلکہ انھیں فعال بنا دیتی ہیں۔ لہٰذا پیکر کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے:

> "۔۔۔ ہر وہ لفظ جو حواس خمسہ میں کسی ایک یا ایک سے زیادہ کو متوجہ اور متحرک کرے پیکر ہے یعنی حواس کے اس تجربے کی وساطت سے ہمارے متخیلہ کو متحرک کرنے والے الفاظ پیکر کہلاتے ہیں (اسی لیے پیکر کی وضاحت کے لیے محاکات کی اصطلاح ناکافی ہے) کبھی کبھی حواس کے مختلف تجربات پیکر یا پیکروں کے ذریعہ اس طرح مل جل کر محسوس ہوتا ہے کہ ایک خوش گوار لیکن مکمل وضاحت سے ماورا امتزاج کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔"[۲۵]

پیکر تراشی میں فن کار کو خواب کی منزل سے گزرنے اور اپنے جذبات کو ہیولے کی شکل میں پیش کرنے کے بجائے حواس خمسہ کو بیدار رکھنا چاہیے کیوں کہ پیکر کے ذریعہ حواس متحرک ہوتے ہیں۔

پیکر تراشی کے ذریعہ شاعر ایسی فضا تخلیق کرتا ہے کہ ہم مناظر کو دیکھنے، آوازوں کو سننے اور بعض کیفیات کو لمس، ذائقہ اور شامہ کی مدد سے محسوس کرنے لگتے ہیں۔

لہٰذا ایذرا پاونڈ جو پیکریت کا امام مانا جاتا ہے اس کے تعلق سے حامدی کاشمیری نے لکھا ہے:

> ''مصورانہ پیش کش پر زور نہیں دیتا، وہ جذباتی پیچیدگی کی لمحاتی صورت گری کو لازمی قرار دیتا ہے۔ یہ صورت گری ایسی ہو کہ حواس خمسہ میں ایک یا ایک سے زائد حواس متاثر ہوں۔۔۔'' ۲۶

گویا اس کے لیے ضروری نہیں کہ پیکر صرف بصری ہو بلکہ وہ کسی بھی کیفیت، تصور یا خیال کو جسم عطا کرسکتا ہے۔ لہٰذا پیکر تراشی حواس خمسہ سے مربوط ہوتی ہے۔
www.dictionary.com میں imagery کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے:

> Imagery is a clear picture that comes to mind, but more importantly, that image has a deper meaning.
>
> Imagery is the mental picture or pictures that a writer creates. In fiction, imagery can involve any and all of the senses, and have very important symbolic value. ۲۷

Nigel J.T. Thomas جو کہ ایک فلسفی ہے، پیکر یعنی Imagery کی تعریف اس طرح سے کی ہے:

"Imagination is what makes our sensory experience meaningful, enabling us to interpet and make sense of it, whether from a conventional perspective of form a fresh, original, individual one. It is what makes perception more than the more physical stimualtion of sense organs. It also produces mental imagery, visual and otherwise, which is what makes it possible for us to think the confines of our present perceptual reality..." ۲۸

اس کے علاوہ پیکر تراشی کا مفہوم Dictionary.com پر اس طرح سے بھی ملتا ہے:

Imagery is any fictional allusion to the five senses. Fundamentally,

imagery in any words which generate an image in a persons head. Such image can be shaped by applying figures to speech like smiles, metaphors, personification and even assonance.

Edger Allan Poe, Ezra Pound and William words worth were said to be the masters of imagery:

"Imagery is even the expression applied to refer to the creation of any know-how in the mentally. It is basically a cognitive procedure applied by a lot of people." [۲۹]

So, in poetry imagery refers to the usage of images that beautifies the poetic diction.

ابوالکلام قاسمی کے مطابق:

''نئی امریکی تنقید کے زیر اثر شاعرانہ امیجری کو ایسی غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی کہ بعض نقادوں نے

شاعری کا اعلیٰ ترین منصب پیکر تراشی سے مخصوص کر دیا۔ ظاہر ہے اس بات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اس حقیقت کو مختلف دبستانوں کے ماہرین شعریات نے یکساں طور پر تسلیم کیا ہے کہ پیکر تراشی کا عمل، استعارہ، تشبیہ اور دیگر سے زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔'' ۳۰

پیکر تراشی کا دائرہ بہت وسیع ہے کیوں کہ اس میں اشاراتی عنصر شامل ہوتا ہے یعنی پیکر پیش منظر سے پس منظر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ George Whalley نے کہا ہے:

''پیکر اکہرا لفظ ہے لیکن پیکر کا وجود غیر معین ہے۔ قطعیت کے ساتھ یہ طے نہیں ہوسکتا کہ پیکر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں پر ختم اور (اس بات کا بھی) کوئی پیمانہ نہیں ہے جس کے ذریعہ ہم یہ کہہ سکیں کہ شاعری میں کیا (چیز) پیکر ہے اور کیا نہیں۔'' ۳۱

کامیاب پیکر وہ ہے جس سے قاری کے تمام حواس بیدار ہوں یعنی شاعر جب کسی چیز کی تخلیق کرے تو اس بات کا خیال رکھے کہ پیکر اس کے تمام حواس پر اثر انداز ہوتے ہوئے شعری تجربے کو اس کے احساس وادراک کی سطح تک پہنچائے۔

پیکر پسند شعرا شاعری کے لیے ٹھوس اور واضح پیکر کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے مطابق شاعری سننے سے زیادہ پڑھنے اور پڑھ کر محسوس کرنے کی چیز ہے۔

اردو شاعری میں میراں جی، ن۔م۔راشد، قاضی سلیم، کمار پاشی، عمیق حنفی،

عادل منصوری، ناصر کاظمی اور عتیق اللہ وغیرہ کے یہاں پیکر تراشی کی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں۔

اب تک پیکر تراشی سے متعلق جتنی بھی تعریفیں ملتی ہیں ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۳۲؎

(i) ذہنی پیکریت

(ii) مجازی پیکریت

(iii) تجسیمی پیکریت

پروفیسر عنوان چشتی نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

(i) ذہنی پیکریت

ذہنی پیکریت خالص ذہنی، وجدانی اور مجرد ہوتے ہیں اس لیے اس پر تجزیاتی اور سائنٹفک انداز سے گفتگو نہیں ہو سکتی۔ اس پیکریت کو لسانی پیکریت کے ذریعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(ii) مجازی پیکریت

مجازی پیکریت میں دو پہلو شامل ہوتے ہیں:

(i) لغوی پیکریت، (ii) مجازی پیکریت

مجازی پیکریت میں کبھی دونوں پہلو بھی شامل ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک تو کبھی صرف دوسرا۔ اس میں خیال اور لسانیاتی پہلوؤں پر گفتگو کی جاتی ہے۔

(iii) تجسیمی پیکریت

اس میں پیکروں کے عمل پر بحث کی جاتی ہے اس کے دائرے میں لغوی اور مجازی دونوں پیکر شامل ہوتے ہیں لہذا پیکر دراصل شاعر کے وجدان، بصیرت اور داخلیت کا انکشاف کرتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے پیکر تراشی کا مقابلہ تشبیہ، استعارے، علامت، محاکات، تمثیل اور تجسیم سے کرلیں تا کہ پیکر تراشی کا تخلیقی عمل واضح ہو جائے۔

تشبیہ کی تشریح وتعریف کرتے ہوئے مرزا محمد عسکری ''آئینہ بلاغت'' میں لکھتے ہیں:

> ''تشبیہ سے مطلب یہ ہے کہ دو ایسی چیزیں بیان کی جائیں جن میں سے کسی ایک یا زیادہ معنی میں مشارکت ہو۔ مثلاً لفظ رخسار اور پھول یا پسینہ اور گلاب وغیرہ رخسار اور پھول میں رنگ کی اور پسینہ اور گلاب میں بو کی مشارکت ہے۔''[۴۳]

بالفاظ دیگر شاعر اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے ایسی چیزوں سے تشبیہ دیتا ہے جنہیں قاری واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔

اس کے برخلاف پیکر تراشی میں شاعر اپنے تصور اور لفظوں کی مدد سے ایسے پیکر تراشتا ہے کہ اس کو پڑھنے والا یا سننے والا شاعری سے صرف افہام و تفہیم کا تعلق قائم نہیں کرتا بلکہ اس کے حواس میں سے کوئی مخصوص حس متحرک ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ گویا امیجری کی تخلیق کسی واقعہ یا تصور واقعہ کی عملی تصویر بن جاتی ہے۔

لہٰذا تشبیہ اور پیکر کے لغوی و اصطلاحی معنوں کے علاوہ ان شعری تکنیکوں کے کام

الگ الگ ہونے کے سبب سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تشبیہ اور پیکر میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے تشبیہ کا کام دو چیزوں میں مشابہت ڈھونڈنا ہے جب کہ پیکر خیالی تصویر بنانے کا نام ہے۔

استعارہ، علم بیان کی ایک شاخ ہے جس کی اہمیت تشبیہ سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ تشبیہ کے مقابلے میں استعارہ زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

بہ قول مولانا عبدالرحمٰن:

''تشبیہ صرف حقیقت کو چمکا کر ختم ہو جاتی ہے اور استعارہ اس سے آگے بڑھتا ہے اور ایک چیز کو دوسری کا لباس پہناتا ہے اور تبدیل صورت سے تبدیل حقیقت کا دعویٰ کرتا ہے۔'' ۳۴

پیکر تراشی، استعارہ سے زیادہ قریب ہے۔ کیوں کہ جب یہ آگے بڑھتی ہے تو مجرد اشیا کی تجسیم بھی کرتی ہے۔ اس کا مرتبہ استعارہ سے بہت بلند ہے۔ کیوں کہ پیکر کا مفہوم استعارہ کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع اور الجھا ہوا ہے۔ استعارہ تجربے کی ایک سطح کو سامنے لاتا ہے تو پیکر ایک سے زیادہ سطحوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کے علاوہ استعارے میں دھندلی تصویر ہوتی ہے تو پیکر میں نمایاں تصویر ہوتی ہے، بلکہ تصویر در تصویر ہوتی ہے۔ گویا پیکریت ایک قسم کی synthesis ہے جس میں خیال اور جذبہ کو اس کی تمام تر پیچیدگی کے ساتھ ظاہر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ استعارے ہی کی طرح پیکر، سادہ، مرکب، پیچیدہ، روایتی اور انفرادی وغیرہ بھی ہوتے ہیں اور اکہرے، تہہ در تہہ بھی ہوتے ہیں۔ ۳۵

استعارہ اور پیکر کی تعریف سے ان دونوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ واضح ہو جاتا ہے۔

علامت نگاری، تخلیقی اظہار کا ایک اہم ستون ہے۔ کوئی لفظ یا پیکر جب اپنے ظاہری معنی کے علاوہ کسی گہرے، وسیع اور تہہ دار معنی کو پیش کرتا ہے تو وہ علامت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے چناں چہ علامت زبان کے ایک مخصوص استعمال سے تشکیل پاتی ہے۔

پیکر اور علامت ایک دوسرے سے معنوی مماثلت نہیں رکھتے۔ ہر چند علامت ایک پیکر ہوتی ہے، مگر تکنیکی خصوصیات کی بنا پر پیکر تراشی میں کوئی پیکر علامت نہیں ہوتی کیوں کہ علامت کا وصف اختصار ہے، جب کہ پیکر کی خاصیت وسعت ہے۔ علامت صرف اشارہ کرتی ہے جب کہ پیکر کسی واقعہ کو من وعن یا چند صورتوں میں پیش کرتا ہے چناں چہ اظہار کا یہ عمل تفصیل چاہتا ہے۔

پیکر تراشی اور محاکات میں بنیادی طور پر بہت فرق پایا جاتا ہے۔ محاکات کے لغوی معنی ''باہم حکایت کرنا'' یا ''آپس میں بات چیت کرنا'' کے ہیں جب کہ پیکر کے لغوی معنی ''شکل'' یا ''جسم'' کے ہیں۔ چناں چہ محاکات کا تعلق صرف آپسی بات چیت ہے اور پیکر کا تعلق تصویر یا خیال کی تجسیم ہے۔ لہٰذا پیکر تراشی کا عمل محاکات کا عمل تو کہلائے گا مگر ہماری حسیات کو جتنا متحرک پیکر تراشی کا عمل جتنا متحرک کر سکتا ہے اتنا محاکات نہیں کر سکتی۔

پیکر صرف واقعہ کو پیش نہیں کرتا بلکہ شاعر کے جذباتی تجربے اور نفسیاتی عوامل کو بھی پیش کرتا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو پیکر کو محاکات سے الگ کرتی ہے کیوں کہ محاکات صرف خارج کے تابع ہوتی ہے جب کہ پیکر خارجی وداخلی دونوں کے باہمی تعلق سے تخلیقی قوت سے تشکیل پاتا ہے۔

اس لیے یہ کہنا کہ پیکر تراشی کا عمل محاکات کا عمل ہے صحیح نہیں ہے کیوں کہ محاکات کی کارکردگی محدود ہوتی ہے اس سے تصویر تو سامنے آجاتی ہے لیکن حواس خمسہ

بیدار نہیں ہوتے جب کہ امیجری یا پیکر تراشی کے عمل میں حواس خمسہ کی بیداری کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

محاکات اور پیکر نگاری کے فرق کو دو الفاظ فرد، جماعت سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرد دراصل جماعت ہی کا حصہ ہے۔ اسی طرح محاکات بھی پیکر کا ایک حصہ ہے۔ گویا پیکر ''کل'' ہے تو محاکات اس کا جزو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح قطرے کے بغیر سمندر کا وجود ممکن نہیں اسی طرح ''جز'' کے بغیر ''کل'' کا تصور بھی ممکن نہیں۔

تمثیل، عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی شکل دکھلانا اور مثال دینے کے ہیں۔ پیکر کے معنی لفظی و خیالی تصویر کے ہیں۔ ان الفاظ کے لغوی معنوں ہی سے دونوں میں جو فرق ہے وہ واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے نقاد تمثال کو پیکر تراشی یعنی image کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جب کہ image کے لیے پیکر کا لفظ ہی ممکن اور مناسب ہے۔

تجسیم کے لغوی معنی ''جسم تراشنے'' کے ہیں۔

یعنی غیر انسانی اشیا کو انسانی صفات عطا کرنا تجسیم کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے

گاتے پھول، بلاتی شاخیں
پھل میٹھے، جل بھی میٹھا تھا

اس کے برخلاف پیکر ایک تصویر ہے جو لفظی بھی ہو سکتی ہے اور خیالی بھی۔ یہ تصویر مکمل ہونی چاہیے نہ کہ ادھوری۔ اگر یہ ادھوری ہے تو وہ مکمل پیکر نہیں ہے۔ کہلائے گی۔

دھوپ کے لال ہرے ہونٹوں نے
تیرے بالوں کو چوما تھا

پیکر تراشی الفاظ کے معنی میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ جو علامت، تشبیہ، استعارے وغیرہ سے قریب ہے۔ یعنی کہ جو کام علامت وغیرہ کا ہے وہی پیکر کا بھی ہے لیکن انداز منفرد ہے۔

پیکر تراشی کی خصوصیت یہ ہے کہ چاہے وہ شاعری میں ہو یا نثر میں اس کا ماحول، ماقبل اور مابعد سے گہرا تعلق ہونا چاہیے تا کہ وہ بہ ظاہر انفرادی یا مقامی ہوتے ہوئے بھی اس کل پر اثر انداز ہوتی محسوس ہوں۔

پیکر کا خاص وصف یہ بھی ہے کہ یہ سیدھے سادے لفظوں میں منظر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور ایسی بھرپور تصویر پیش کرتا ہے جیسے یہ تمام مناظر قاری کی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے ہوں۔

اس کے علاوہ پیکر کی خاصیت یہ بھی ہے کہ کسی نظم یا شعر میں بنیادی پیکر کے ساتھ ساتھ ثانوی پیکر بھی نظر آتے ہیں تا کہ بنیادی پیکر کی خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہو اور ثانوی پیکر اپنی انفرادیت کو بنیادی پیکر میں ضم کر کے نظم یا شعر کی داخلی فضا کو اور زیادہ پُر اثر بناتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض نظموں یا غزلوں میں پیکروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے اشتراک کرتا رہتا ہے اور نظم یا غزل کی تشکیل میں مدد دیتا ہے لہذا یہ تمام پیکر یکساں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ان میں سے اگر کسی ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو نظم یا غزل کے مفہوم پر بہت اثر ہوتا ہے۔ بسا اوقات پیکر ایک دوسرے کے متضاد بھی ہوتے ہیں بہ ظاہر ان میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا مگر ان میں معنوی ربط ضرور ہوتا ہے۔[۳۶]

سلیم شہزاد کے مطابق کسی بھی شعر کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے پیکر ایک مؤثر رول ادا کرتی ہے اور کسی بھی تخلیق میں پیکر کی اثر انگیزی کا انحصار اس کی چند خصوصیات پر

ہوتا ہے۔

1۔ بنیادی اور ابتدائی سطح پر الفاظ اور خیال کا واضح ہونا

2۔ رنگ و آہنگ کا امتزاج

3۔ حرکت

4۔ شعر کی داخلی ہیئت کی تشکیل میں معاونت وغیرہ ۳۷

اگر یہ خصوصیات کسی بھی شعری پیکر میں موجود نہ ہوں تو وہ پیکر کو تشبیہ، استعارہ یا محاکات میں تبدیل کر سکتی ہے۔

اردو شاعری میں پیکر تراشی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ شاعری کے ساتھ ساتھ خود شاعر تک پہنچا جا سکتا ہے۔

Elizabeeth Jennen نے امیجری کی اہمیت اس طرح سے بیان کی ہے:

> "Imagery is the heart of poetry and the life of language, is employed for purposes."۳۸

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا امریکن میں امیجری کی اہمیت کا اظہار اس طرح سے کیا گیا ہے:

> ''زبانی اور تحریری دونوں طریقوں میں صنائع figure of speech (جن میں image بھی شامل ہے) مختلف مقاصد کا حق ادا کرتی ہیں ان کا استعمال مطلب کو صاف کرنے کے لیے، مثالیں دینے کے لیے، زور پیدا کرنے کے لیے، جماعتوں اور جذبات کو بھڑکانے

کے لیے، بے روح اشیا میں روح پھونکنے کے لیے،
دل لگی یا تزئین کاری کے لیے ہوتا ہے اور سب سے
بڑھ کر یہ ان کا ایک اہم جمالیاتی مقصد دنیائے
خیالات اور دنیائے اشیا کے ردعمل کی تعمیق و توسیع کی
ترتیب و تفہیم کا ہوتا ہے۔''۳۹

شاعر اپنی شاعری میں پیکر تراشی کا استعمال شعر کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے کرتا ہے۔ حقیقی شاعر وہی ہے جس کے یہاں پیکر اس کی زبان، قلم یا ذہن سے فطری طور پر آموجود ہوتے ہوں۔ اس کے علاوہ امیجری کا اہم کام یہ ہے کہ وہ شعر میں حسن و رعنائی کو دوبالا کرتی ہے۔

امیجری کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس کے استعمال سے کلام میں سلاست، روانی اور اثر آفرینی کے ساتھ ساتھ ابہام کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ لہذا امیجری شاعری میں مختلف مقاصد کی تکمیل کا حق ادا کرتی ہے جس سے مصنف کے ساتھ ساتھ نقاد کو بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے چناں چہ امیجری کا مطالعہ ادب میں ایک اضافے کی اہمیت کا باعث ہے جس کے ذریعہ ادب میں نئی شاخیں پیدا ہوتی ہے اور ادب و تنقید میں ترقی کی راہیں استوار ہو سکتی ہیں۔

امیجری ایک جدید شعری روایت ہے جس کے ذریعہ شاعر کے کلام کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ شاعر تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ شاعر کی اہم اور خاص باتیں جو دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں کی جاسکتی وہ امیجری کے ذریعہ سے حاصل کی جاسکتی ہے کیوں کہ شاعر اپنی تخلیق میں عام روایت سے ہٹ کر گفتگو کرتا ہے۔

دراصل کسی شاعر کے کلام میں پیکر تراشی کے مطالعہ اور تجزیہ کے ذریعہ اس کے

اسلوب اور اس کی انفرادیت کو سمجھا جا سکتا ہے جو اس کی شناخت کو بدل دیتی ہے۔

مس اسپر جین نے امیجری کی اہمیت کی اس طرح وضاحت کی ہے:

''شاعر کی امیجری کا مطالعہ ہمیں خود شاعر کی ذات، اس کے ذہن، اس کے تجربات، دلچسپیاں اور اس کے گہرے خیالات کے قریب تر پہنچا دیتا ہے۔ امیجری سے شاعر کے تخیلی اور تصویری زاویہ نگاہ سے اس کی اپنی تخلیقات کے بارے میں خود شاعر کے خیالات پر نئے اور تازہ زاویہ سے روشنی پڑتی ہے۔''[۴۰]

شاعر کی تخلیقات میں ایسے پرُ معنی پیکر موجود ہوں، جو ایک سے زائد ادوار پر چھائے ہوئے ہوں، اور شاعر کی فن کارانہ صلاحیت کی طرف اشارہ کرتے ہوں جس سے اس کے تصور کی گہرائی، فکر کی گیرائی اور اس کے خیالات کے تسلسل اور اس کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔

امیجری کے ذریعہ ہم شاعر کے چھپے ہوئے خیالات، اندرونی نظریات اور اس کے مزاج کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ شاعر کی طبیعت اور اس کا مزاج جس طرح کا ہوگا ویسے ہی اس کے خیالات اور رجحانات بھی ہوں گے۔ ویسے ہی اس کے الفاظ بھی ہوں گے اور ویسے ہی اس کے ذہن میں پیکر بنیں گے۔ غرض امیجری کے ذریعہ شاعر کی داخلی دنیا کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن کے پردوں میں چھپی ہوئی دنیا بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے۔

امیجری کی اہمیت سب سے زیادہ اس بات میں مضمر ہے کہ وہ شاعر کو اس کا پیغام قاری تک پہنچانے میں مدد دیتی ہے اور ایک حد تک اس کو تعاون بھی فراہم کرتی ہے جس

کی وجہ سے شاعر کو اپنے مقصد کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے امیجری کے ذریعہ شاعر اپنا مقصد نمایاں طور پر دوسروں کے دل و دماغ تک پہنچا سکتا ہے۔ اسی لیے شاعری میں امیجری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

پیکر تراشی کا بنیادی مقصد لفظی تصویر بنانا ہے۔ اس کے تعلق سے C. Day Lewis نے اپنی تصنیف "The Poetic Image" میں لکھا ہے:

> "لفظی تصویر بنانا امیج سازی کا بنیادی مقصد ہے اور یہ
> کہ اس وقت پوری نظم ایک مکمل image بن جاتی ہے
> جب اس کے مختلف حصوں میں متنوع پیکروں کی تخلیق
> ایک ساتھ مل کر مبسوط اور مرکب تشکیل کا روپ اختیار
> کر لیتی ہے۔"[۴۱]

پیکر تراشی کا سب سے اہم مقصد مجرد تصورات کو مجسم شکل میں تبدیل کرنا ہے اس کے علاوہ پیکر میں دو عناصر اور ہوتے ہیں خارجی اور داخلی۔ داخلی عناصر کے ساتھ ساتھ خارجی عناصر بھی جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ پیکر میں آہنگ بھی شامل ہوتا ہے۔ عمدہ پیکر وہ ہے جو قاری کو چونکانے کا کام کرتا ہے۔ جب تک پیکر سمجھ میں نہیں آتا مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

پیکروں کا انتخاب دو صورتوں سے عمل میں لایا جا سکتا ہے ایک یہ کہ پیکر کا استعمال صرف آرائش خیال کے لیے کیا جائے یہ تو مصنوعی پیکریت ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ پیکر خود بہ خود شاعر کے شعری تجربوں کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں یہ اصل پیکریت ہے۔[۴۲]

لہٰذا پیکر کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ پیکر واضح، روشن اور نمایاں ہونا چاہیے تاکہ معنی کی ترسیل موثر ہو سکے۔ مبہم پیکر معنی کی ترسیل میں مکمل طور پر کامیاب نہیں

ہوتے۔ کامیاب پیکر وہ ہوتے ہیں جو قاری یا سامع کے ذہن کے در کھولے اور ان کو معنی کی تہوں تک پہنچائے۔

پیکر تراشی کا تعلق جذبات سے بھی گہرا ہوتا ہے۔ ہر پیکر مخصوص حسی یا حواس کے ذریعہ کسی جذباتی ردعمل کو بیدار کرتے ہیں۔

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے

کبھی دیکھی تھی اس کی ایک جھلک
رنگ سا جم رہا ہے آنکھوں میں

امیجری یا پیکر تراشی کا تعلق نفسیات سے ہے، سوچنے سے ہے۔ وہ تصاویر جو ذہن میں بنتی ہیں اپنا ایک حسیاتی ردعمل رکھتی ہیں۔ سوچنے کا عمل پیکروں کے تسلسل سے تشکیل پاتا ہے یہ عمل بڑی حد تک غیر شعوری ہوتا ہے۔

پیکر تراشی کا فنون لطیفہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ Bronowski کے مطابق:

> ''تخیل کا تعلق پیکر بنانا ہے، پیکر تراشی کر کے یا بنا کر انھیں ذہن میں ایک نئی ترتیب دینا ہے آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ سائنس میں تخیلی تجربے کی تصدیق طبعی تجربے کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے جب کہ ادب میں تخیلی تجربے کی توثیق انسانی تجربے سے ہوتی ہے۔''[۴۴]

تشبیہ اور استعاروں کی مدد سے پیکر تراشی کا کام لیا جاتا ہے خاص طور پر جب غیر مرئی کیفیات کو مرئی چیزوں سے تشبیہ دی جاتی ہے تو وہ زیادہ ''محسوس'' بن جاتی ہیں۔ ان

کی مدد سے شاعر حقیقی کے علاوہ فرضی اشیا کی ایسی تصویریں پیش کرتا ہے جو قاری کی بصیرت میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔

امیجری کسی خاص واحد شکل میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ مختلف صورتوں میں رونما ہوتی ہے۔ اس کا خاص تعلق مصنف یا شاعر کے ذہن سے ہوتا ہے کہ وہ امیجری کا کس طرح سے استعمال کرتا ہے۔ امیجری کا عمل خواب اور بے خوابی دونوں حالتوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جس قدر شاعر کی معلومات وسیع اور تجربہ گہرا ہوگا اسی قدر تخیل کی کارفرمائی اعلیٰ طریقہ سے انجام پائے گی۔ چناں چہ امیجری کے حدود کا تعین کرنا مشکل ہے اور اس کے اقسام کی قطعی فہرست بنا دینا ناممکن نہیں تو ممکن بھی نہیں اور یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امیجری کا دائرہ کار یہی ہے اور وہ اس کے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔[۴۴]

پیکر تراشی کے نام سے یہ دھوکا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر صرف ایسے پیکر تراشے گا جنھیں آنکھوں ہی سے دیکھا جا سکتا ہے کیوں کہ پیکر تراشی صرف بصارت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ سمعی اور ذوقی پیکر بھی تراشے جا سکتے ہیں۔ جنھیں سنا جا سکتا ہے، چکھا جا سکتا ہے وغیرہ۔

Dictionary of Terms میں پیکر کے اقسام اس طرح سے درج ہیں[۴۵]

۱۔ استعارہ۔ کنایہ

۲۔ خیال

۳۔ ذہنی تصویر

۴۔ تشبیہ۔ تصویر

۵۔ مجسمہ۔ بت

فضائی تصویر، شبیہ سمعی، شبیہ مابعد، بعد شبیہ، شبیہ راست، شبیہ کاذب، شبیہ معکوس،

شبیہ حافظہ، شبیہ بصری، شبیہ حقیقی، شبیہ مجازی۔

اس کے علاوہ امیجری کی تقسیم دو طرح سے بھی کی جاتی ہے۔[۴۶]

۱۔ مرئی امیجری

۲۔ غیر مرئی امیجری

مرئی امیجری یعنی ایسے پیکر جو نظر آتے ہیں اور جن کو دیکھا جا سکتا ہے جن کا تعلق محسوسات سے ہے مثلاً شاہین، کبوتر، سمندر، تلوار، شجر، پہاڑ، بادل، افق اور دھنک وغیرہ۔

غیر مرئی امیجری وہ ہے جو نظر نہیں آتے اور غیر محسوس ہوتے ہیں مثلاً خدا رسول، جنت، دوزخ، عرش، عشق، اذاں، فقر، خدائی عقل، نظر وغیرہ۔

www.dictionary.com میں امیجری کے اقسام اس طرح سے ملتے ہیں:

> There are four kinds of images, that are used in poetry to appeal to various senses such as the gustatory images which pleases the sense of taste, the olfactory images which please the sense of smell, the tactile images which appeal to the sense of touch, the auditory images which appeal to sense of hearing and the kinaesthetic image

which represents the sense of motion. Imagery is when the author goes into details maily focusing with the sense of sight.
Imagery is any of the five senses (sight, touch, smell, hearing and taste) Essentially, imagery is any series of words that creat a picture in your head. Such images can be created by using figures of speech such as smile, metaphors, personification and assonance. Imagery helps the reader picture what is going on."[۴۷]

حواس خمسہ کے لحاظ سے پیکر کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بصری، استحالی، لمسی اور حرکی پیکر وغیرہ۔ جب کوئی لفظ کسی جذبے کو پہچانتا ہے تو مختلف قسم کے حسی پیکر بیدار ہوتے ہیں اور ایک ہی وقت میں کئی پیکروں کا عمل شروع ہوتا ہے۔ چوں کہ ادبی تخلیق کا عمل زیادہ تر پیکر تراشی سے مربوط ہے اسی لیے کسی ادب پارے کی تعریف و تحسین کے لیے پیکر تراشی کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پیکروں کی تقسیم حواس خمسہ کے اعتبار سے مندرجہ ذیل ہیں۔ [۴۸]

(۱) بصری، (۲) سماعی، (۳) شمومی، (۴) مذوقی، (۵) لمسی وغیرہ۔

(۱) بصری پیکر : وہ پیکر جو حس بصارت کو متوجہ کرتے ہیں یہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ (i) شکل سے متعلق، (ii) رنگ سے متعلق، (iii) حرکت سے متعلق۔

اب بھی ہر گھر کے کالک لگے طاق پر میرے بوسوں کی پرچھائیاں ثبت ہیں
ایک دیا ہوں میں یادوں بھری رات کا مت جلاؤ ہواؤں کے رخ پر مجھے
(نشتر خانقاہی)

شکل سے متعلق:

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا
(ظفر اقبال)

ایک اجالے کو سخن کرتے سنا ہے میں نے
ہونٹ لو دیتے ہیں لفظوں سے دیے جلتے ہیں
(سلیم احمد)

رنگ سے متعلق پیکر:

شفق کا رنگ جھلکتا تھا لال شیشوں سے
تمام اجڑا مکاں شام کی پناہ میں تھا
(منیر نیازی)

دل سے بے ساختہ اٹڈے ہے بڑھاؤ کف دست
آج آنسو کو بھی ہم رنگ حنا پاؤ گے
(حسن نعیم)

حرکی پیکر:۔

میں نوحہ گر ہوں بھٹکتے ہوئے قبیلوں کا
اجڑتے شہر کی گرتی ہوئی فصیلوں کا
(محمد علویؔ)

(۲)سماعی پیکر : وہ پیکر جو حس سماعت کو متوجہ کرتے ہیں۔

یہ میری ذات ہے کہ کوئی گونجتا کھنڈر
اپنی صدا پہ آپ ہی پاگل ہوا ہوں میں
(من موہنؔ تلخ)

(۳)شمومی پیکر : وہ پیکر جو حس شامہ کو متوجہ کرتے ہیں۔

یہ کس نے چھین لئے مجھ سے خوشبوؤں کے مکان
یہ کون دشت کی دیوار کر گیا مجھ کو
(انور صدیقیؔ)

(۴)مذوقی پیکر: وہ پیکر جو ذائقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہونٹوں پہ جاگ اٹھا تھا مرے خون کا ذائقہ
لذت بڑی عجیب تھی صحرا کی پیاس میں
(ممتاز راشدؔ)

(۵)لمسی پیکر : وہ پیکر جو حس لامسہ سے متعلق ہے یہ دو طرح کے ہوتے ہیں:

(a) نرمی وسختی ظاہر کرنے والے (b) گرمی یا سردی کا احساس دلانے والے

آخری بوسے کی ٹھنڈی راکھ بس ہونٹوں پہ ہے
اب کہاں وہ سرخ انگارے جو پانی ہوگئے
(نشتر خانقاہی)

کیا لمس تھا اک دست حنائی کا تہہ آب
انگارے سے ہاتھوں میں دہکتے رہے تادیر
(سلیم احمد)

گھاس میں جذب ہوئے ہوں گے زمیں کے آنسو
پاؤں رکھتا ہوں تو ہلکی سی نمی لگتی ہے
(سلیم احمد)

میرؔ کے اس شعر میں یہ تمام پیکر موجود ہیں۔

بو کے کمھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے رے
ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہو لطافت ہائے رے

چوں کہ پیکر حسی اور ادراکی ہوتے ہیں لہذا حواس خمسہ کی نسبت سے ان کے نام دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیکر کے اور بھی کئی اقسام ہیں۔ ۴۹؎

۱۔ حرارتی پیکر (Thermal Image) : اس سے ہم گرم چیزوں کا احساس کرتے ہیں اور ذہن میں حرارتی پیکر بنا لیتے ہیں۔

خورشید کی صلیب نے روشن کیا مجھے
میں دشت تیرگی میں مگر آبرو سے تھا

چنار شاخ، زرنگاہ، دھوپ میرے سر پہ تھی
غبار بام و دربنا، زمین تخت ہوگئی
(زیبؔ غوری)

میلوں تلک تھی پھیلی ہوئی دو پہر کی قاش
سینے میں بند سینکڑوں صدیوں کی پیاس تھی
(وزیر آغا)

۲۔ برودتی پیکر (Nibernal Image) : اس سے ہم سرد چیزوں کا احساس کرتے ہیں اور ذہن میں برودتی پیکر بنالیتے ہیں۔

ہم جسم سے ہٹا نہ سکے کاہلی کی برف
جس کی تہوں میں خواب بڑے تابناک تھے
(باؔنی)

یہ برف سی تیرے چہرے پہ کیوں پگھلنے لگی
میری نگاہ میں خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا
(شکیبؔ جلالی)

۳۔ محرک پیکر (Empatino Image): اس سے ہم ذہن میں مختلف قسم کے پیکر بنالیتے ہیں۔

پتہ پتہ بھرتے شجر پر ابر برستا دیکھو تم
منظر کی خوش تعمیری کو لمحہ لمحہ دیکھو تم
(باؔنی)

۴۔ استغراقی پیکر (Sinaetic Image): اس قوت سے ہم کسی تخلیق

کے حسن میں کھو جاتے ہیں اور اس عالم میں یہ پیکر بنتے ہیں۔

نہ بلبلوں کی اذان ہے نہ تتلیوں کا طواف
ابھی چمن میں گل نو بہار ہے تنہا
(حسن نعیم)

وہ بڑھ رہی ہے اندھیروں کی سلطنت ہر پل
وہ آ رہی ہے اجالوں کی فوج ہاری ہوئی
(شہریار)

جگ مگ کرتی ساری بستی آج دھوئیں کی دلدل ہے
شعلہ بکف آندھی، آندھی نے پھیلائی آگ
(مخمور سعیدی)

۵۔ اس کے علاوہ ایک احساس رنگ بھی ہے جس کے ذریعہ ہم کسی چیز کو ایک حواس سے دوسرے حواس کی طرف منتقل کر لیتے ہیں مثال کے طور پر کسی آواز کو سن کر ذہن کسی رنگ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس رنگ کے پیکر بنا لیتا ہے اس کو رنگین سامعہ یا الوانی سامع کہتے ہیں۔

اے ساعت اول کے ضیاء ساز فرشتے
رنگوں کی سواری کے نکلنے کی خبر دے

۶۔ متحرک پیکر (Dynamic Image) : اس قسم کے پیکر میں پیکر اگر ذہن میں متحرک ہو تو اس کو متحرک پیکر کہتے ہیں۔

ترے خطوں کی لکیروں سے اب بھی اٹھتی ہے
لپک، دمکتی ہوئی انگلیاں چلانے کی

کھل گئی تھی آندھیوں کے سامنے دل کی کتاب
ایک کاغذ سا ہوا میں دیر تک اڑتا رہا
(بمل کرشن اشک)

۷۔ جامد پیکر(Static Image): پیکر اگر خاموش اور پُر سکون ہوں تو جامد پیکر کہلاتے ہیں۔

جھیلوں کے آس پاس تھے خیمے سکوت کے
ہنگامۂ حیات تو آب رواں میں تھا
(حسن نعیم)

اوس کی بوندوں میں بکھرا ہوا منظر جیسے
سب کا اس دور میں یہ حال ہے میرا ہی نہیں
(شکیب جلالی)

دن کے ڈھلتے ہی اجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں
(احمد فراز)

۸۔ رنگین پیکر(Colove Image): اگر پیکر رنگ برنگ کا ہو تو اس کو رنگین پیکر کہتے ہیں۔

سنہری مچھلیاں بادل میں کوند جاتی ہیں
بدن وہی ہے جو بندش میں بھی قبا سے لڑے
(بشیر بدر)

سیاہ رات کے سر پر سفید پھول کھلا
روایتوں میں بڑی پیچ دار جدت ہے
(بشیر بدر)

مرجھا گیا جو دل میں اجالے کا سرخ پھول
تاروں بھرا یہ کھیت بھی بنجر لگا مجھے
(شکیب جلالی)

کوئی بھولی ہوئی شئے طاق ہر منظر پہ رکھی تھی
ستارے چھت پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی
(باقی)

۹۔ بے رنگ پیکر (Occoorleis Image): اگر پیکر بے رنگ ہوں تو وہ بے رنگ پیکر کہلاتے ہیں۔

یہ کیسے لوگ ہیں صدیوں کی ویرانی میں رہتے ہیں
انہیں کمروں کی بوسیدہ چھتوں سے ڈر نہیں لگتا
(سلیم احمد)

پہنچ گیا ہوں زماں و مکاں کے میلے تک
مری انا مجھے الزام نارسائی نہ دے
(مظہر امام)

۱۰۔ آزاد پیکر (Free Image) : بعض پیکر ایسے ہوتے ہیں جو اپنے تخلیقی نقطہ نظر سے بالکل آزاد ہوتے ہیں اور کسی نظم یا

غزل میں ایک دوسرے سے ظاہری ربط نہیں رکھتے وہ آزاد پیکر کہلاتے ہیں۔

خواب سے آگے

میں اندھیروں سے ڈرتی تھی
شام کے تصور سے
میرے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے
میری شریانیں پھٹنے لگتیں
اور میں ہراساں
گھر کے سارے بند دریچوں،
دروازوں کو کھول کر
لمبی لمبی سانسیں لیتی
بجلی کے چلے جانے پر
چیخ چیخ کر گلا سوکھ جاتا
ایسے میں نہ میں نے کبھی شیطان کو دیکھا
اور نہ کسی خونخوار جانور کو
لیکن یہ خلش، یہ انتشار،
یہ افراتفری...........
کیا میں نے مستقبل کے خالی پن کو
اندھا کنواں سمجھ لیا!
یا پھر یہ کسی بیماری کی کونپلیں تھیں؟

جو میرے دل و دماغ میں
سوئیوں کی طرح
روزن کر رہی تھیں
ایک روز
ایسا اندھیرا چھایا
کہ میری چیخیں بھی سلب ہو گئیں
اور میں نے اندھیرے میں
روشنی تلاش کرنے کا عمل
ترک کر دیا......
بند آنکھوں نے جوں ہی
اندھیرے کے پاتال میں اترنا سیکھا
ہر طرف
نور کی برسات ہونے لگی

(شائستہ یوسف)

۱۱۔ محصور پیکر (Tied Image): یہ پیکر ایسے وقت میں نمودار ہوتا ہے جب قاری مطالعہ میں غرق ہوتا ہے اور ذہن میں ایک کے بعد دیگر پیکروں کے سلسلے بنتے چلے جاتے ہیں۔

کتبہ

بیتے ہوئے دنوں کی
تاریخ لکھی ہے جس پر

میں اپنی قبر کا

وہی

ایک کتبہ ہوں!

۱۲۔ یادداشتی پیکر (Memory Image) : ایسے پیکر جن کا تعلق ماضی کی یادوں سے ہے وہ یادداشتی پیکر کہلاتے ہیں۔

یاد آتی ہیں وہ شامیں جب رسم و راہ کسی سے تھی
ہم بیکل ہونے لگتے تھے جوں جوں یہ دن ڈھلتا تھا

ایک صورت سی یاد ہے اب بھی
آپ اپنی مثال تھی، کیا تھی

وہ بساط شعر و نغمہ رت جگے وہ چہچہے
پھر وہی محفل سجادے زندگی اے زندگی

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

۱۳۔ تخیلی پیکر (Fancy Image): جن پیکروں کا تعلق مستقبل سے ہے وہ تخیلی پیکر کہلاتے ہیں۔

یونہی گر چلتی رہی بے آسرا، بے سنگ میل
فاصلوں کی گرد میں پاگل ہوا ہوجائے گی

عجب نہیں کہ مسافر پلٹ کے آجائے
لرزتی پلکوں پہ اک دیپ سا جلا رکھنا

(وزیر آغا)

آسماں کا سرد سناٹا پگھلتا جائے گا
آنکھ کھلتی جائے گی منظر بدلتا جائے گا
(باقیؔ)

۱۴۔ باشعوروہمی پیکر (Eidetic Image): ایک ایک پیکر جس کا تجربہ اس قدر شدید انداز میں ہو کہ وہ بالکل اصلی محسوس ہونے لگیں وہ باشعور پیکر ہے۔

اس کے آنے کی خبر سن کے دیار جاں میں
خوں دل سے در و دیوار کی زینت کی ہے
(مخمور سعیدیؔ)

ذبح کرنے پڑے شہر بیدار میں، جب بھی خوابوں کے جنگلی کبوتر مجھے
اپنے ہی خون سے صبح لتھڑا ملا، خوشبوؤں سے بھرا میرا بستر مجھے
(نشترؔ خانقاہی)

عجب نہیں جواگیں یاں درخت پانی کے
کہ اشک بوئے ہیں شب بھر کسی نے دھرتی میں
(شکیبؔ جلالی)

۱۵۔ وہمی پیکر (Nalluginatocy Image): جب پیکر پر حقیقت کا گمان گزرنے لگے تو وہ وہمی پیکر ہے۔

خوف چہرے پہ چہرے بدلتا ہوا
سنسنی سانپ بستر پہ رات ہیں
(نشترؔ خانقاہی)

۱۶۔ مصنوعی نومی پیکر (Hypna Cobid Image): غنودگی کے عالم میں کوئی پیکر نظر آتا ہے تو وہ اس نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

راتیں لوگو سنو پیکراں ہوگئیں
مشعلیں جتنی تھی سب دھواں ہوگئیں

پھیلتا جائے گا صحرائے سکوت
دور کی آواز بنتے جاؤ گے
(شہریارؔ)

خیالوں میں سرشام اس کے سائے پھیل جاتے ہیں
نگاہوں میں چمک اٹھتا ہے پرتو صبح دم اس کا
(مخمور سعیدیؔ)

مس اسپرجین نے شیکسپیر کی امیجری کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتی ہیں:

''جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں اس کی (شیکسپیر کی) Images کا تمام ڈھانچہ خاص طور پر دو زمروں میں آتا ہے ایک وہ جو فطرت سے ہیں اور دوسرے وہ جو روزانہ زندگی اور رسومات سے ہیں۔''[۵۰]

لہٰذا انھوں نے امیجری کی تقسیم معاشرہ اور سماج کو مد نظر رکھ کر کی ہے۔ انھوں نے پیکروں کی تقسیم سماج اور کائنات کے مطابق کی ہے۔ اسپرجین نے فطرت کے زمرے میں دس قسم کی images بتائی ہیں:

''دیہاتی زندگی، موسم اور اس کی تبدیلیاں،

آسمان، طلوع آفتاب اور صبح صادق، بادل، بارش اور ہوا، دھوپ اور چھاؤں، باغ، پھول، درخت، بالیدگی اور افسردگی Growth & Decay پانی اور تالاب، ندیاں اور کنارے، نباتات اور سمندر اور جہاز، حیوانات، چڑیا اور کیڑے، مکوڑے، کھیل تماشے، چہچہاتے پرندے، شکار اور اڑنا اور منڈلانا وغیرہ۔"۵۱

اسپرجین کے مطابق روزانہ خانگی زندگی کی اشیا میں پیکر کی تقسیم:

"خصوصی طور پر خانگی امور اور معمولات، کھانا، پکانا اور پینا، خاک، دھول، زنگ، جسم و اطفال، جسم، نیند اور خواب، کپڑے اور سامان، عام دستکاریاں، اشیا کا احساس چکنا، نرم یا سخت، آتش، شمع اور لیمپ وغیرہ۔۔۔"۵۲

اس کے علاوہ اشخاص کے گروہوں کی بھی ایک قسم ہے جس کو اسپرجین نے ضمیمہ کے طور پر لکھا ہے جن میں بادشاہ، دربان، سپاہی، قیدی اور خدمت گزار وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ چند قدامت پسند images بھی بتائی ہیں مثلاً جنگ، اسلحہ جات اور بندوقیں وغیرہ۔ کچھ موسیقی اور قانون سے کچھ فنون عمومہ یعنی painting وغیرہ کی بھی بیان کی ہیں۔۵۳

W.H. Clemen نے Imagery کی تقسیم اس طرح سے کی ہے۔ ۵۴

1.	Absract Imagery	غیر محسوس پیکر
2.	Cosmic Imagery	جہانی یا کائناتی پیکر

3. Animal Imagery حیواناتی پیکر

4. Disease Imagery مرض پیکر

5. Nature Imagery فطرتی پیکر

6. Sea Imagery بحری پیکر

7. Dog Imagery سگی پیکر

8. Tree Imagery درختی پیکر

Robin Skelton کے مطابق پیکر تراشی کی حسب ذیل قسمیں ہیں:۵۵؎

S.No.			
1.	Simple image	A word which arouses ideas of sensory perception	Cold, bright, loud, better, tree, yellow, hardhand house
2.	Abstraction	A word which arouses to no idea of sensory perception	Truth, concept, idea, accuracy, justice, satirical cunning, willy, wise
3.	Immediate image	An image fundamentally concerned which arouses idea of touch, sound, sight, small taste	Yellow, loud, rough, stench, acid
4.	Diffuse image	An image concerned only indirectly with stimulating the senses, or restricted in its appeal to no one sense	Meetiing, desire, parting, laziness, wearness, vigour

5.	Abstract image	An abstraction which contrives to arouse ideas of sensory perception because of personification or similar devices.	Truth, merey, love, accurate, justice.
6.	Combined image	A combination of words containing only one true image	Cold as charity, knife red revolution, immemoriabelm.
7.	Complex image	A combination of words containing more than one true image	Bee-loud, glade, golden, dffodits, bitter rice.
8.	Combined Abstract image	A combination of words containing one abstract image, and no true images	Noble, truth, just mercy.
9.	Complex Abstract image	A combination of words containing more than one abstract image, and no true image	Faithfully charity sincere love
10.	Abstract combine and abstract complex image	A complex or combined image in which the abstraction is of more importance than the image in which the image or images, merely quality the abstraction.	Golden accuracy cold, chaste, charity.

K.H. Ansari نے اپنی کتاب John Webster میں مس اسپرجین کی فطرت اور Indoor Life Imagery کے علاوہ مزاج، انصاف، خواہش یا جذبہ، لطف، اصلیت، دیانت اور شہرت وغیرہ کے پیکروں کی نشاندہی کی ہے۔[۵۶]

نفسیات کی روشنی میں پیکروں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔[۵۷]

(۱) بلاواسطہ، (۲) بالواسطہ

(۱) بلاواسطہ: اس پیکر کو کہتے ہیں جو حواس خمسہ کی مدد سے فوراً تشکیل پاتے ہیں۔

(۲) بالواسطہ: اس پیکر کو کہا جاتا ہے جس میں حسیاتی نظام کا عمل راست طور پر نہیں ہوتا بلکہ ان میں حسی عناصر پائے جاتے ہیں اس نوعیت کی بنا پر اس کو پانچ مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(i) حافظے کے پیکر، (ii) تخیلی پیکر، (iii) نیم خوابی پیکر، (iv) خوابی پیکر، (v) وہمی پیکر وغیرہ۔

نفسیات کا تعلق خاص طور سے نیم خوابی اور وہمی پیکروں سے ہوتا ہے۔ الغرض جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ پیکر تراشی کے اقسام کی قطعی فہرست تیار کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے اس کے علاوہ اور بھی پیکر وجود میں آئیں جن کے ناموں کا تعین نہ کیا گیا ہو اور دوسرے عوامل سے ان کی تفہیم بھی کی جائے۔ مثال کے طور پر جو پیکر خوشی کا اظہار کرتے ہیں وہ نشاط آور پیکر کہلاتے ہیں۔ ایسے پیکر جن سے ناامیدی ظاہر ہوتی ہو وہ یاس پرستانہ پیکر ہے اور جن سے امیدیں وابستہ ہوں وہ رجائیانہ پیکر کہلاتے ہیں اس کے علاوہ ایسے بھی پیکر پائے جاتے ہیں جس کا تعلق جوش، ولولہ، عزم و ہمت سے ہوتا ہے ایسے پیکروں کو شجاعتی پیکر کہتے ہیں۔[۵۸]

علامت پسندی کی طرح پیکریت بھی ایک تحریک ہے۔ چوں کہ پیکر کا تعلق شاعری سے صدیوں پرانا رہا ہے لہذا دو ہزار سال قبل شاعری کی یہ تعریف کہ ''شاعری لفظی مصوری'' ہے (بہ قول رومی نقاد Horace کے) کی وجہ سے پیکریت بین الاقوامی سطح پر شاعری کے ایک عام رجحان کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ ۵۹

چوں کہ Imagism دراصل علامت پسندی ہی کی طرح ایک محدود شعری نظریہ ہے لیکن علامت پسندی کے مقابل اس کے حدود کچھ زیادہ وسعت کے حامل ہیں کیوں کہ اس کا جھکاؤ فن کی طرف زیادہ ہے لہذا اسی وجہ سے شعراء علامت پسندی سے زیادہ پیکریت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب جدید شعری لفظیات کو سمجھا جا سکتا ہے چوں کہ یہاں لفظی پیکر سے سابقہ پڑتا ہے اس لیے نئے پیکر تراشنے میں بڑے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ۶۰

''امیجری'' ایک تحریک کی حیثیت سے سب سے پہلے انگلستان میں شروع ہوئی۔ ہیوم نے ۱۹۰۸ء میں شاعروں کا ایک کلب قائم کیا تا کہ انگریزی شاعری میں انقلاب لایا جا سکے۔ ہیوم چوں کہ برگساں سے متاثر تھا لہذا ۱۹۱۷ء تک ہیوم کا یہ نجی کلب ''امیجزم'' کو فروغ دیتا رہا اور نظم معرا، جاپانی اور چینی شاعری سے اثرات قبول کرنے کی تلقین کرتا رہا۔ اس کے آغاز میں ٹیگور، ڈبلیو بی ایٹس اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس اس تحریک سے وابستہ تھے لیکن بعد میں الگ ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں مس لاول نے اس تحریک کی رہنمائی کی مگر بعد میں وہ گردابیت کی قائل ہو گئیں۔ ۶۱

شاعری میں پیکریت کی تحریک کا آغاز بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی ۱۹۰۹ء کے آس پاس ہوا۔ پیکریت پسندوں کے گروہ میں ایذرا پاونڈ، ہل داڈ ولٹل، جے۔ جی۔ فلیچر، ایمی لویل کے علاوہ امریکی شعرا اور ٹی۔ ای۔ ہیوم، رچرڈ ایلڈنگٹن،

ڈی۔ایچ۔لارنس اور ایف۔ایس۔فلنٹ وغیرہ انگلستانی شعرا کے نام سرفہرست ہیں ان تمام نے نہ صرف شاعری میں پیکر تراشی کو فروغ دیا بلکہ اس کے اصول بھی مرتب کرنے کی کوشش کی۔[62]

Flint نے سب سے پہلے ۲۵/ مارچ ۱۹۰۹ء کو ایفل ٹاور کی ایک ہوٹل میں میٹنگ منعقد کی جس کے ممبران میں F.Farr، Edwards Storer، F.W. Tencred اور Joseph Campbell وغیرہ نے شرکت کی اور منگل کے دن ایک رائے ہو کر اس تحریک کو عملی شکل دی اور ان تمام نے ایک مینی فیسٹو تیار کیا جس کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ موضوعات کا آزادانہ انتخاب اور براہ راست اظہار
۲۔ نئے موڈ کے اظہار کے لیے نئے آہنگ کی تشکیل
۳۔ عام بول چال کی زبان میں مناسب ترین الفاظ کا استعمال
۴۔ شعری، پیکر کا استعمال، ابہام سے سے گریز، cosmic شعرا کی مخالفت
۵۔ شعر کی تخلیق میں غیر یقینی رویہ اختیار کرنے سے گریز
۶۔ ارتکاز کو شاعری کی روح قرار دینا، گویا ارتکاز Concentration اور عضویاتی آہنگ Organic Rhythm کا لازمی استعمال۔[63]

امیجزم کو باضابطہ تحریک کی حیثیت ۱۹۱۲ء سے حاصل ہوئی جو بین الاقوامی سطح پر ایک اہم شعری رجحان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۱۴ء میں Des Imagist اور ۱۹۱۷ء تک Some imagist جیسے شعری مجموعوں نے بڑے قارئین کو اپنے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا۔ اس تحریک کے خاص تین ارکان B.S. Flint، T.E. Hume اور R. Aldington تھے۔ امریکی اراکین میں Ezra Pound اور Amy Lowell پیش

پیش تھے۔ ۶۴

گلوسری آف ورلڈ ٹرمز میں اس تحریک کا بیان اس طرح سے کیا گیا ہے:

"Imagism was poetic movement in England and the United States between the year 1909 and 1917 organised as a revolt against what Ezra Pound called the "rather blurry messy.... sentimantatistic mannerised" poetry of this Nineteen century. Ezra Pound the first leader of this movement was succeeded by Army Lowell. Other leading imagist were H. (idla) D. Oobittle, John Govld Fletchere, F.S Flint, and Richard Aldington, as voiced in "Some imagist poets" (1915) edited by a my lowell, declared for a poetry which is free to choose any subject and to create its own rhythms, is expressed in common speech and presents on

image that is hard, clear, and concentrated. The imagists usually wrote in free verse (its seams safe to say that the following example by Ezra Pound exceed all other imagist poems in this style of its concentration.

The image in this and any other imagist poems present the impressions made by an object on a particular poet in a particular situaton, so that his literary movement is related to literary "IMPRESSIONISM".۶۵

امیجزم تحریک کے بانیوں نے توازن اور اعتدال پر بہت زور دیا۔ اس کے علاوہ ان کا ماننا تھا کہ شاعری میں کسی بھی بات کا من وعن اظہار ہو۔ انھوں نے جذبات کے اظہار کے لیے نئے نئے اوزان تلاش کیے اور نظم آزاد کو کافی فروغ دیا۔ ان کے نزدیک شاعری کی سب سے اہم خوبی اختصار اور ایجاز تھا پیکر نگار شعرا موضوعات کے انتخاب میں مکمل آزادی کے ساتھ ساتھ دھندلی اور غیر واضح شاعری کے بجائے ٹھوس اور صاف شاعری کی تخلیق کے قائل تھے۔

مغرب میں امیجری یا پیکر تراشی بہت ضروری سمجھی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ کسی شاعر کی تخلیقات کی تفہیم میں پیکر تراشی کی تلاش ضروری قرار دی جاتی ہے جب کہ اس کے برخلاف مشرقی تنقید ایک عرصے تک پیکر تراشی کے مفہوم سے دور رہی، زیادہ سے زیادہ محاکات پر زور دیا جانے لگا لیکن جدید شاعری نے پیکر تراشی پر بہت زیادہ زور دینا شروع کیا اور تمام جدید شعرا کے یہاں اس کے نقوش تلاش کیے جانے لگے۔

ہر دور کے شعرا نے اپنے اپنے انداز سے پیکر تراشی کی ہے لیکن تشبیہ، استعارہ، علامت اور محاکات وغیرہ کے ناموں کے تحت۔ ان تمام میں تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے۔ تاہم جدید دور میں پیکر تراشی کا اپنا ایک منفرد رنگ ہے اور پیکر کا یہ رنگ باقاعدہ ایک فن بن گیا۔

تخلیقی زبان پیکر، استعارہ، علامت وغیرہ سے تشکیل پاتی ہے۔ جدید شعرا تشبیہ سے کام لینے کے بجائے دوسری صنعتوں کو ترجیح دے رہے تھے جن میں پیکر بہت اہم کردار انجام دیتا ہے۔ پیکر دراصل شعر کی تزئین نہیں کرتا بلکہ یہ شعر کی جان ہوتا ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ پیکر ایک ذہنی اختراع ہے اور اس کا عمل فطری اور بنیادی عمل ہے۔ نفسیات کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ پیکروں کی تخلیق کا تعلق ماضی کے تجربات سے ہوتا ہے یعنی جب انسان کسی چیز کو دیکھتا یا سنتا ہے تو اس کے متعلق اس کے ذہن میں ایک قسم کا نقشہ بن جاتا ہے اور یہ عمل مختلف اشخاص میں مختلف طرح کا ہوتا ہے۔

اس طرح ناصر کاظمی نے تقسیم کے وقت جو حالات دیکھے، جو فسادات دیکھے، جس سے ہر انسان گزر رہا تھا۔ اسی کو انھوں نے اپنی شاعری میں پیکروں کی مدد سے پیش کیا۔ ان کو پیکر تراشنے کے لیے ماحول کے ساتھ ساتھ مناظر بھی بہت سود مند ثابت ہوئے۔

پیکروں کی تخلیق کے اس فطری عمل میں ہر شخص عموماً اور فن کار خصوصاً محسوس کی

ہوئی چیزوں کو ذہنی تصویر میں تبدیل کرتا ہے۔ اس طرح حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل کیے گئے خیالات ذہن میں نقش کی صورت میں قائم رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنی شکل بدل کر سامنے آئے ہیں۔ ۶۶؎

ناصؔر کاظمی کے یہاں ماضی کے تجربات کا جو عکس ہے وہ بھیس بدل کر پیکر کی صورت میں سامنے آتا ہے اسی لیے ان کے پیکر اس طرح سے بھی بنتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ پیکر کی تخلیق صرف مادری زبان ہی میں ہونی چاہیے بلکہ تخلیق کار جو زبانیں جانتا ہے اس میں پیکر کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ تخلیق کار جس زبان میں اس کا اظہار کرنا چاہتا ہے یہ خیالات اس زبان کے الفاظ کا روپ دھار کر لفظی تصویروں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن چوں کہ ہر شخص اپنی مادری زبان میں زیادہ قدرت رکھتا ہے اور اپنے خیال کو مادری زبان ہی میں بڑی آسانی سے پیش کر سکتا ہے۔ اسی لیے ناصؔر کاظمی نے اپنی مادری زبان ہی میں اپنے حسی خیالات وافکار کی روشنی میں کئی نادر پیکر تراشے ہیں۔ ۶۷؎

ناصؔر کاظمی نے تخلیقی زبان کی بنیاد یعنی پیکریت سے آگہی حاصل کی۔ ان کے پیکر بہ یک وقت بصری، سمعی، شامی اور لمسی کیفیات کو حرکت میں لاتے ہیں۔ ۶۸؎ ع

گل ریز میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ
شفق ہوگئی دیوار خیال

ناصؔر کاظمی کے یہاں پیکر تراشی ان کے شعری مزاج کا قدرتی اظہار ہے کیوں کہ ناصؔر ہمیشہ بیدار رہتے تھے اس لیے شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی اور مصوری سے بھی وہ رشتہ جوڑتے ہیں۔ چناں چہ وہ خود لکھتے ہیں:

''میں تو موسیقی اور مصوری کو بھی اپنی روایت سمجھتا ہوں

اس کی وجہ یہ ہے کہ مصوری اور موسیقی انسانی تہذیب
کے لاشعور میں محفوظ رہتی ہیں اور ان کے شعور کا اظہار
شاعری ہے ۔۔۔ موسیقی اور مصوری شاعری کی
آنکھیں ہوئیں۔'' ۶۹

ناصؔر کاظمی کے یہاں ہر شعر تخلیقی ذہن کا پیکر بن کے ابھرتا ہے جس کی بے ساختگی، شگفتگی اس کی انفرادیت بن جاتی ہے۔ یہ برجستگی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ تخلیق کے دوران میں سرمستی سے سرشار ہوتے ہیں۔

ناصؔر کاظمی کے یہاں دریا، پتھر، پرند، چرند اور درختوں کی زبان وغیرہ دراصل ان کے حسی اور تخلیقی تجربوں کی زبان ہے۔ یہ تمام پیکر ان کے خیال اور الفاظ کو جسم عطا کرتے ہیں۔ ان کے دل کی روشنی ہر لفظ کو ایک شخص اور ہر مصرعے کو ایک شہر بنا دیتی ہے: ۷۰

ہر لفظ ایک شخص ہے، ہر مصرعہ ایک شہر
دیکھوں مری غزل میں مرے دل کی روشنی

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں روشنی کے پیکر کا استعمال نہایت کثرت اور ندرت سے کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں پیکر، علامت کے شانہ بہ شانہ چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ روشنی کے پیکر کی مثال کے لیے یہ شعر ملاخطہ ہو

سر کھلے پا برہنہ کوٹھے پر
رات اسے ماہتاب میں دیکھا

ناصؔر کی اس غزل کے تمام اشعار روشنی کے پیکروں کا مجموعہ ہیں۔ یہ پیکر چاند کی روشنی سے رنگ و نغمہ حاصل کرتے ہیں اور فضا کو سحر آلود کر دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر شعر میں چاند کی روشنی ایک انفرادی فکر رکھتی ہے۔ یہ روشنی کے پیکر ناصؔر کاظمی کی

جمالیاتی شخصیت کی تہہ داری کے مظہر ہے۔اے

ناصر کاظمی کے یہاں سر رئیل اسٹک پیکر بھی موجود ہیں اور یہ پیکر ان کی لاشعور زندگی کے وحشی پن، خوف اور بے بسی و بے کسی کو ظاہر کرتے ہیں یہ پیکر دراصل دیوانے کے خواب کی تجسیم کرتے ہیں اور خارجی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے:۲ے

ع ہر ذرہ ایک محمل عبرت ہے دشت کا

ع آنکھ جھپکوں تو شرارے برسیں

ع دروازے سر پھوڑ رہے ہیں

ناصر کاظمی کے یہاں متضاد پیکر بھی نظر آتے ہیں جس کی زندہ مثال یہ شعر ہے۔

میں اس جانب تو اس جانب
بیچ میں پتھر کا دریا تھا

ناصر کاظمی کی شاعری کا سلسلہ برگِ نے سے لے کر ان کی زندگی کے آخری متفرق اشعار تک جاری رہا جس میں اداسی کے ساتھ ساتھ خوشی کے بھی احساسات پائے جاتے ہیں۔ان کی شاعری کا خاص وصف یہ ہے کہ انھوں نے تخیل کو اس دہلیز تک پہنچا دیا جہاں اس کی شبیہ قاری کو بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ناصر کاظمی نے ایک ساتھ مختلف حسوں کو برتا ہے اور ان کے امتزاج سے ایسے پیکر تراشے ہیں جو دکھائی بھی دیتے ہیں اور سنائی بھی۔۳ے

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں پیکر تراشی سے جس طرح کا کام لیا ہے اس کا مختلف مجموعوں کے حوالے سے جائزہ لیا جا رہا ہے جو کچھ اس طرح کا ہے۔

ناصر کاظمی کے پیکروں کو حواس خمسہ کے اعتبار سے تقسیم کیا جا رہا ہے مثلاً (۱) بصری، (۲) سمعی، (۳) شمومی، (۴) مذوقی اور (۵) لمسی پیکر۔

(ا) بصری پیکر

وہ پیکر جو حس بصارت کو متوجہ کرتے ہیں بصری پیکر کہلاتے ہیں یہ تین طرح کے ہوتے ہیں:

(i) شکل سے متعلق، (ii) رنگ سے متعلق، (iii) حرکت سے متعلق۔

I۔ شکل سے متعلق:۔

کلیاں جھلسی جاتی ہیں
سورج پھینک رہا ہے آگ

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہوگئے ہیں

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

کیسا سنسان ہے سحر کا سماں
پتیاں محو یاس گھاس اداس

پھر سلگنے لگے یادوں کے کھنڈر
پھر کوئی تاک خنک یاد آئی

سوچتا ہوں کہ سنگ منزل نے
چاندنی کا لباس کیوں پہنا

درد کے جھونکوں نے اب کی دل ہی ٹھنڈا کر دیا
آگ برساتا تھا آگے دیدۂ خونبار بھی

سورج سر پر آپہنچا
گرمی ہے یا روز جزا

نگاہ یاس کو نیند آ رہی ہے
مژہ پر اشک بوجھل ہو گئے ہیں

پاؤں چلنے لگی جلتی ہوئی ریت
دشت سے جب کوئی آہو نکلا

دل کی حویلی پر مدت سے
خاموشی کا قفل پڑا ہے

تختہ ریگ پر کوئی دیکھے اسے
سانپ کے زہر میں رس ہے پھن پھول ہے

چاند نکلا افق کے غاروں سے
آگ سی لگ گئی درختوں میں

جاہلوں کی کھیتی
پھول پھل رہی ہے

کشتیوں کی لاشوں پر
جمگھٹا ہے چیلوں کا

چاند کے دل میں جلتا سورج
پھول کے سینے میں کانٹا تھا

تنہائی کا دکھ گہرا تھا
میں دریا دریا روتا تھا

ٹھنڈی دھوپ کی چھتری تانے
پیڑ کے نیچے پیڑ کھڑا تھا

بھولی نہیں اس رات کی دہشت
چرغ پہ جب تارا ٹوٹا تھا

چاند بھی پتھر، جھیل بھی پتھر
پانی بھی پتھر لگتا تھا

میں اس جانب تو اس جانب
بیچ میں پتھر کا دریا تھا

آگ کی محل سرا کے اندر
سونے کا بازار کھلا تھا

وہم کی مکڑی نے چہرے پر
مایوسی کا جال بنا تھا

پتھر کی دیوار سے لگ کر
آئینہ تجھے دیکھ رہا تھا

پٹ بیجناس انکھڑیاں گل چاندنی سے تاج
چونچوں میں خس کی تیلیاں پنجوں میں پنجنی

بوٹا بوٹا ہے سانپ کی تصویر
پتا پتا ہے سانپ کا ٹیکا

آسماں جیسے سانپ کی کنڈلی
تارا تارا ہے سانپ کا منکا

یہاں پھلتا نہیں کوئی آنسو
یہاں جلتا نہیں کسی کا دیا

پہاڑوں میں میدان میں جنگل میں آگ
سمندر میں خشکی میں جل تھل میں آگ

بجھے یوں اجالوں میں تیرہ ضمیر
پریشاں ہو جیسے دھوئیں کی لکیر

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

درد کی شاخ تہی کاسہ میں اشکوں کے نئے پھول کھلے
دل جلی شام نے پھر مانگ بھری ہم نفسو شکر کرو

سوکھے جارہے ہیں گل بوٹے
باغ کانٹے اگائے جاتا ہے

دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر
لگی ہے آگ کہیں رات سے کنارے پر

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصؔر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ایک سمے ترا پھول سا نازک ہاتھ میرے شانوں پر
ایک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل

II۔ رنگ سے متعلق:

رنگ کھلے صحرا کی دھوپ
زلف گھنے جنگل کی رات

زلف شب رنگ کے صد راہوں میں
میں نے دیکھا ہے طلسمات کا چاند

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہوگئے سونا ہوئے رخسار بھی

آج تو یہ دھرتی
خون اگل رہی ہے

سبز سنہرے کھیتوں پر
پھواریں سرخ لکیروں کی

میلی چادر اوڑھنے والے
تیرے پاؤں تلے سونا ہے
سونا جسم سفید قمیص
گورے ہاتھ سنہرے پھول

لال کھجوروں نے پہنے
زرد بگولوں کے کنگن

ہرے گلاس میں چاند کے ٹکڑے
لال صراحی میں سونا تھا

سرخ چناروں کے جنگل میں
پتھر کا ایک شہر بسا تھا

پیلے پتھریلے ہاتھوں میں
نیلی جھیل کا آئینہ تھا

پتھر کا اک سانپ سنہرا
کالے پتھر سے لپٹا تھا

زرد گھروں کی دیواروں کو
کالے سانپ نے گھیرا تھا

نئے دیس کا رنگ نیا تھا
دھرتی سے آکاش ملا تھا

دور سے دریاؤں کا سونا
ہرے سمندر میں گرتا تھا

اونچی کھلی فصلیں، فصیلوں پر برجیاں
دیواریں سنگ سرخ کی دروازے چندنی

جھل جھل جھلک رہے تھے پس چادر اغیار
خیمے شفق سے لال، چتر تخت کندنی

جگمگ جگمگ کنکریوں کا
دشت فلک میں جال بچھا تھا

III۔ حرکت سے متعلق:۔

اوس بھی ہے کہیں لرزاں
بزم انجم دھواں دھواں بھی ہے

رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری
لے کے پھر آئی نذرانۂ گل

نہر کیوں سو گئی چلتے چلتے
کوئی پتھر ہی گرا کر دیکھو

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھینکا ہوگا

برف کے نگر میں
آگ جل رہی ہے

خواہشوں کی ڈالی
ہاتھ مل رہی ہے

برف کے ہاتھ پیانو بجاتے رہیں
جام چلتے رہیں مئے اچھلتی رہے

یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں میں
پکارتی ہے ہوا اب کسے کنارے پر

چادر اوڑھ کے شبنم کی
نکلے آنکھیں ملتے پھول

ہوا چلی تو جاگے پھول
ناؤ چلے تو ندیا جاگے

اب جی میں ہے کہ سر کسی پتھر سے پھوڑیے
ممکن ہے قلب سنگ سے نکلنے کوئی پری

دو روحوں کا پیاسا بادل
گرج گرج کر برس رہا تھا

دو دریاؤں کا چڑھتا دریا
ایک ہی ساگر میں گرتا تھا

شام کا شیشہ کانپ رہا تھا
پیڑوں پر سونا بکھرا تھا

پتھر کی اندھی گلیوں میں
میں تجھے ساتھ لیے پھرتا تھا

نیل گگن سے ایک پرندہ
پیلی دھرتی پر اترا تھا

بارش کی ترچھی گلیوں میں
کوئی چراغ لیے پھرتا تھا

محل میں ہیروں کا بنجارا
آگ کی کرسی پر بیٹھا تھا

پیاسی کونجوں کے جنگل میں
میں پانی پینے اترا تھا

آرہی ہے لکیر سانپوں کی
ہر گلی پر ہے سانپ کا پہرا

پہاڑوں سے لاوا نکلنے لگا
جگر پتھروں کا پگھلنے لگا

آنکھ آنکھ میں بھیگی نیند
ہونٹ ہونٹ سے جھڑتے پھول

تیرا رستہ تکتے تکتے
کھیت گگن کا سوکھ چلا ہے

آنکھیں اب تک جھانک رہی ہیں
وہ پانی کتنا گہرا تھا

دور کے پیڑ کا جلتا سایہ
ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا

پلک اٹھاتے ہی چنگاریاں برستی ہیں
بجھی ہے آگ سے کیا زیارپائے شام فراق

کچھ اس اداس اڑا جارہا ہے ابلق رنگ
صبائے پاؤں ٹھہریئے نہیں رکابوں میں

صبا گل کی نس نس میں بسنے لگی
اجلاؤں کی برکھا برسنے لگی

(۲) سمعی پیکر

وہ پیکر جو حس سماعت کو متوجہ کرتے ہیں۔ سمعی پیکر کہلاتے ہیں۔

دن کا سنہرا نغمہ سن کر
ابلق شب نے موڑی باگ

کڑے کوسوں کے سناٹے ہیں لیکن
تری آواز اب تک آ رہی ہے

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سن

یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شورِ درا غور سے سن

دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

سن کے آوازۂ زنجیرِ صبا
قفسِ غنچہ کا در وا ہوگا

اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی
اک شرر پھول میں لرزا ہوگا

چیختی ہیں ڈراونی راتیں
چاند نکلا ہے آسماں سے دور

پھر دردنے آگ راگ چھیڑا
لوٹ آئے وہی سمے پرانے

پھر چمکنے لگی سونی راہیں
ساربانوں کی صدا پھر آئی

زاغ و زغن کی چیخوں سے
سونا جنگل گونج اٹھا

رات کی گہری سیٹی سن کر
رات کا جنگل گونجا ہوگا

چیخ رہے ہیں خالی کمرے
شام سے کتنی تیز ہوا ہے

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آرہی ہے ابھی

آسماں لالہ خونیں کی نواؤں سے جگر چاک ہوا
قصر بیداد کی دیوار گری ہم نفسو شکر کرو

اس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی

صدائیں آتی ہیں اجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر

گونگی وادی گونج اٹھتی تھی
جب کوئی پتھر گرتا تھا

جیسے جل پریوں کا ناچ
جیسے پائل کی جھن جھن

ہنستا پانی، روتا پانی
مجھ کو آوازیں دیتا تھا

سارنگیاں سی بجتی تھیں جب کھولتے تھے پر
یکبار گونج اٹھتی تھی سنساں کنگنی

سریلی ہواؤں نے چھیڑا وہ راگ
لگی اوس سے خیمہ گل میں آگ

اٹھی اک صدا بام کے متصل
جسے سن کے پھٹ جائے پتھر کا دل

نئی رت نے چھیڑا نیا ارغنوں
فضا میں جھلکتا ہے لمحوں کا خوں

(۳) شمومی پیکر

وہ پیکر جو حس شامہ کو متوجہ کریں شمومی پیکر کہلاتے ہیں۔

آنکھ جھپکوں تو شرارے برسیں
سانس کھینچوں تو رگ جاں چمکے

خوشبوؤں کی اداس شہزادی
رات مجھ کو ملی درختوں میں

مٹی کی خوشبو لینے
نیل گگن سے اترے پھول

آج وہ سیڑھی سانپ بنی تھی
کل جہاں خوشبو کا پھیرا تھا

جلنے لگیں درختوں میں خوشبو کی بتیاں
پھر چھیڑ دی ہوائے نیستاں نے سمفنی

(۴) مذوقی پیکر

وہ پیکر جو ذائقہ سے تعلق رکھتے ہوں مذوقی پیکر کہلاتے ہیں۔

کاغذ کے دل میں چنگاری
خس کی زباں پر انگارہ تھا

دھوپ کے لال ہرے ہونٹوں نے
تیرے بالوں کو چوما تھا

پیاسی لال لہو سی آنکھیں
رنگ لبوں کا زرد ہوا تھا

رہتی تھی اس نواح میں ایسی بھی ایک خلق
پوشاک جس کی دھوپ تھی، خوراک چاندنی

کسی بے نام وہم کی دیمک
چاٹنے آگئی لہو میرا

(۵) لمسی پیکر

وہ پیکر جو حس لامسہ سے تعلق رکھتے ہیں لمسی پیکر کہلاتے ہیں۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ نرمی و سختی ظاہر کرنے والے

۲۔ گرمی یا سردی کا احساس دلانے والے

دیواروں سے آنچ آئی تھی
مٹکوں میں پانی جلتا تھا

چاندنی کا ایک پھول گلے میں
ہاتھ میں بادل کا ٹکڑا تھا

بھیگے کپڑوں کی لہروں میں
کندن سونا دمک رہا تھا

آنچ کھا کھا کر صدائے رنگ کی
تتلیوں کے پر سنہرے ہو گئے

تو جنت ماہی گیروں کی
تو سندر بن مرے گیتوں کا
تو ٹھنڈی رات جزیروں کی

میں سوتے سوتے کئی بار چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

مرکب پیکر:

اس کے علاوہ وہ ناصر کاظمی کے یہاں مرکب پیکر کی مثالیں وافر تعداد میں موجود ہے جو حسب ذیل ہیں۔

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

سورج سر پر آپہنچا
گرمی ہے یا روز جزا

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھینکا ہوگا

جب تیز ہوا چلتی ہے سر شام
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تری یادیں

یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں میں
پکارتی ہے ہوا اب کسے کنارے پر

چین سے بیٹھنے نہیں دیتی
موسم یاد کی اداس ہوا

لال کھجوروں نے پہنے
زرد بگولوں کے کنگن

دو روحوں کا پیاسا بادل
گرج گرج کر برس رہا تھا

ٹھنڈی چھوپ کی چھتری تانے
پیڑ کے نیچے پیڑ کھڑا تھا

پھر چمکنے لگی سونی راہیں
ساربانوں کی صدا پھر آئی

اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی
اک شرر پھول میں لرزا ہوگا

پھر چاند کو لے گئیں ہوائیں
پھر بانسری چھیڑ دی صبا نے

تھم گئے ریت کے رواں چشمے
سوگیا گیت ساربانوں کا

دشتِ شب میں ابھر کے ڈوب گئی
کسی ناگن کی ہولناک صدا

میں ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارہ شام بن کے آیا ہرنگ خوا سحر گیا وہ

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اُسے ڈھونڈتی ہے ہردم
وہ بوئے گل تھا مگر نغمۂ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ

وہی دنوں میں تپش ہے وہی شبوں میں گداز
مگر یہ کیا کہ مری زندگی میں سوز نہ ساز

میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مار
یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے

تو جہاں چند روز ٹھہرا تھا
یاد کرتا ہے تجھ کو آج وہ گھر

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

آنکھ جھپکوں تو شرارے برسیں
سانس کھینچوں تو رگ جاں چمکے

جلتی سانسوں کی گرمی سے
شیشۂ من پگھلا جاتا تھا

لفظوں میں بولتا ہے رگ عصر کا لہو
لکھتا ہے دست غیب کوئی اس کتاب میں

پچھلی رات کی تیز ہوا میں
کورا کاغذ بول رہا تھا

لال کھجوروں کی چھتری پر
سبز کبوتر بول رہا تھا

گرجنے لگیں آگ کی بدلیاں
جھلسنے لگیں پیاس سے کھیتیاں

دکھ کی دھوپ میں یاد آئے
تیرے ٹھنڈے ٹھنڈے بال

لہذا پیکر تراشی کے ذریعہ شاعر یا ادیب کے فن اور فکر دونوں کا مطالعہ ممکن ہی نہیں نہایت آسان بھی ہے۔

اس لحاظ سے ناصؔر کاظمی کے فن کا مطالعہ پیکر تراشی کے ذریعہ کرنا زیادہ مناسب اور فائدہ مند ہے اور اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر ناصؔر کاظمی کے فکر وفن کو پیکر تراشی کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناصؔر کاظمی نے بہت صاف گوئی سے آسان روش کو اپناتے ہوئے اپنے تخلیقی عمل کو آگے بڑھایا ہے جس کی وجہ سے عام قاری بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ صاف گوئی اور سادگی کے باوجود ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت بھی موجود ہے اور ان کے یہاں ہر شعر شائستگی کا پیکر معلوم ہوتا ہے۔ لہذا جب تک ناصؔر کاظمی تخلیقی عمل میں مصروف رہے اپنے تخیل کی تکمیل میں لگے رہے اور قاری کو اپنی جانب کھینچتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو ادب کے بہت بڑے شاعر گزرے ہیں اور قاری خواہ وہ خاص ہو کہ عام ہر ایک کو اپنی شاعری سے متاثر کرتے رہے۔ غرض ناصؔر کاظمی کو بہ حیثیت شخص و شاعر بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

حوالے

۱۔ اعجاز اللغات، ص:۲۱۶

۲۔ بحوالہ رفعت اختر، علامت سے امیج تک، ص:۸۷

۳۔ آکسفرڈ ڈکشنری، ص:۴۸۶

۴۔ بہ حوالہ شہناز رعنا۔ پیکر تراشی کی تفہیم اور اس کی حدیں، ص:۳۶

۵۔ بہ حوالہ توقیر احمد خاں۔ شعریات بال جبرئیل، ص:۱۴

۶۔ بہ حوالہ رفعت اختر۔ علامت سے امیج تک، ص:۸۳

۷۔ عنوان چشتی، اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، ص:۴۴۶، ۴۴۷

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ عمر فاروق، اصطلاحاتِ نقد و ادب، ص:۵۹

۱۱۔ توقیر احمد خاں، شعریاتِ بال جبریل، ص:۷، ۸

۱۲۔ بہ حوالہ عنوان چشتی۔ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، ص:۲۴۶

۱۳۔ بہ حوالہ عابدہ رخسانہ۔ استعارہ اور علامت، ص:۱۷۹، ۱۸۰

۱۴۔ بہ حوالہ توقیر احمد خاں۔ شعریات بال جبرئیل، ص:۱۸

۱۵۔ بہ حوالہ شہناز رعنا۔ پیکر تراشی کی تفہیم اور اس کی حدیں، ص:۳۶

۱۶۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۶۱
۱۷۔ بہ حوالہ انیس اشفاق۔ اردو غزل میں علامت نگاری، ص:۶۴
۱۸۔ بہ حوالہ پروفیسر ارشاد علی خاں، جدید اصول تنقید، ص:۱۵۲
۱۹۔ توقیر احمد خان، شعریاتِ بال جبریل، ص:۲۱
۲۰۔ بہ حوالہ عنوان چشتی۔ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، ص:۲۴۸
۲۱۔ بہ حوالہ رفعت اختر۔ علامت سے امیج تک، ص:۸۳
۲۲۔ بہ حوالہ عمر فاروق۔ اصطلاحات نقد و ادب، ص:۶۰
۲۳۔ انیس اشفاق۔ اردو غزل میں علامت نگاری، ص:۶۱، ۶۲
۲۴۔ سلیم شہزاد، اردو شاعری کے ابجد، ص:۵۴
۲۵۔ بہ حوالہ شہناز رعنا۔ پیکر تراشی کی تفہیم اور اس کی حدیں، ص:۳۶
۲۶۔ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص:۶۱
۲۷۔ www.google.com
۲۸۔ NigelJ.T.Thomas،www.google.com.in. ص:انٹرنیٹ
۲۹۔ بہ حوالہ www.google.com
۳۰۔ بہ حوالہ ابوالکلام قاسمی۔ شاعری کی تنقید، ص:۱۲۴
۳۱۔ بہ حوالہ انیس اشفاق۔ اردو غزل میں علامت نگاری، ص:۶۴، ۶۵
۳۲۔ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔ ص:۲۴۹
۳۳۔ بہ حوالہ منظر اعظمی۔ اردو میں تمثیل نگاری۔ منظر اعظمی، ص:۲۰
۳۴۔ بہ حوالہ منظر اعظمی۔ اردو میں تمثیل نگاری، ص:۲۱
۳۵۔ عنوان چشتی۔ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، ص:۱۷۳

۳۶۔ عنوان چشتی۔اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت،ص:۲۶۰
۳۷۔ سلیم شہزاد۔جدید شاعری کی ابجد،ص:۵۸
۳۸۔ بہ حوالہ رفعت اختر۔علامت سے امیج تک،ص:۹۸
۳۹۔ بہ حوالہ توقیر احمد خاں۔شعریات بال جبرئیل،ص:۳۰،۳۱
۴۰۔ بہ حوالہ توقیر احمد خاں۔شعریات بال جبرئیل،ص:۳۰
۴۱۔ بہ حوالہ ابوالکلام قاسمی۔شاعری کی تنقید،ص:۱۲۳
۴۲۔ عنوان چشتی۔اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت،ص:۲۶۰
۴۳۔ بہ حوالہ عابدہ رخسانہ۔استعارہ اور علامت،ص:۱۸۲،۱۸۳
۴۵۔ بہ حوالہ توقیر احمد خان۔شعریات بال جبرئیل،ص:۲۷
۴۶۔ توقیر احمد خاں،شعریاتِ بال جبریل،ص:۲۶
۴۷۔ www.geogle.com.in
۴۸۔ شہناز رعنا۔پیکر تراشی کی تفہیم......ص:۳۶
۴۹۔ عنوان چشتی۔اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت،ص:۲۵۲
۵۰۔ بہ حوالہ توقیر احمد خان۔شعریات بال جبرئیل،ص:۲۳
۵۱۔ ایضاً،ص:۲۴
۵۲۔ ایضاً
۵۳۔ ایضاً
۵۴۔ ایضاً
۵۵۔ بہ حوالہ رفعت اختر،علامت سے امیج تک،ص:۹۵
۵۶۔ بہ حوالہ توقیر احمد خان۔شعریات بال جبرئیل،ص:۲۵

۵۷۔ عنوان چشتی۔ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت

۵۸۔ توقیر احمد خان۔ شعریاتِ بالِ جبریل۔ ص:۲۷

۵۹۔ بہ حوالہ سلیم شہزاد۔ جدید شاعری کی ابجد۔ ص:۵۳

۶۰۔ ایضاً، ص:۵۵

۶۱۔ بہ حوالہ رفعت اختر۔ علامت سے امیج تک، ص:۷۳، ۷۴

۶۲۔ بہ حوالہ عمر فاروق۔ اصطلاحات نقد و ادب، ص:۶۰

۶۳۔ بہ حوالہ رفعت اختر۔ علامت سے امیج تک، ص:۷۳

۶۴۔ ایضاً، ص:۷۴

۶۵۔ ایضاً، ص:۷۶، ۷۷

۶۶۔ توقیر احمد خاں، شعریات بال جبریل، ص:۳۹

۶۷۔ ایضاً

۶۸۔ بہ حوالہ حامدی کاشمیری۔ جدید شعری منظر نامہ، ص۶۳

۶۹۔ ایضاً، ص:۲۶

۷۰۔ شمیم حنفی۔ غزل کا نیا منظر نامہ

۷۱۔ بہ حوالہ حامدی کاشمیری۔ ناصر کاظمی کی شاعری، ص:۴۵

۷۲۔ ایضاً، ص:۵۵

۷۳۔ علی جاوید، فکر و تحقیق، ص:۱۰۵، ۱۰۶

حاصل مطالعہ

یہ طے ہے کہ شاعر اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کا ان تبدیلیوں سے مکمل طور پر واقف ہونا اس کے شعور کی فعالیت کو ظاہر کرتا ہے اور یہیں سے وہ اپنی شاعری میں تجربہ پسندی کے لیے وجہ تلاش کرتا ہے اور اپنی شاعری میں اس کو برتتا ہے۔

ناصؔر کاظمی کی زندگی میں ایک بہت بڑا جذباتی حادثہ وقوع پذیر ہوا جسے تقسیم ہند کے نتیجے میں ہجرت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ناصؔر کاظمی نے اس حادثہ کو اپنی تخلیقی قوت بنالیا کیوں کہ یہ صرف ایک شخص کا المیہ نہیں تھا بلکہ ایک پوری تہذیب وثقافت کا المیہ تھا۔ ان کے یہاں ۱۹۴۷ء کے فسادات، تقسیم اور ہجرت کے المیہ نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کا تخلیقی سفر جو کہ ہجرت کے نتیجے میں شروع ہوا تھا وہ مطابقت پیدا نہ کرسکا، وہ سدا پیچھے دیکھتے رہے، ان کا سارا دھیان وہیں اٹکا ہوا تھا جہاں وہ جلتے خیمے چھوڑ کر آئے تھے۔ ناصؔر کاظمی کا حال سے کوئی تعلق نہیں تھا جو کچھ تھا وہ ان کا ماضی۔

ناصؔر کاظمی کی شاعری کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ اگر ہجرت کی تباہی کا اندازہ کرنا ہے تو ناصؔر کاظمی کی شاعری کا مطالعہ کیجیے کیوں کہ اس دور کے سفر کا مسافر اپنے تمام جذبات واحساسات کے ساتھ یہاں موجود ہے۔

ناصرؔ کاظمی کا سماجی شعور بہت ہی پختہ اور معنی خیز ہے وہ ایک سچے شاعر کی طرح حقائق بیان کرنے میں کسی قسم کی مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے جس کی وجہ سے جہاں ان میں حال سے متعلق بے اطمینانی پائی جاتی ہے وہیں وہ ایک خوشحال مستقبل کی بشارت بھی دیتے ہیں، ان کو یقین ہے کہ حالات بدلیں گے۔ ناصرؔ کاظمی نے اپنے عہد کا انتشار اور ابتری کا بیان ایسے اسلوب میں کیا ہے جو بے حد دھیما اور نرم و نازک ہے۔

ناصرؔ کاظمی کے عہد میں ادبی انتشار بھی موجود تھا ایک طرف ترقی پسند تحریک کا غلبہ تو دوسری جانب حلقۂ اربابِ ذوق کا اختلاف لہذا ان کے ادبی مقام کے تعین کے لیے یہ جاننا بہت ہی ضروری ہے علاوہ ازیں ان کے ہم عصروں کا ذکر بھی کارفرما ہوسکتا ہے۔

چناں چہ کسی بھی شاعر کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔

ناصرؔ کاظمی کا اصلی نام ناصر رضا ہے آپ ۸/ دسمبر بہ روز ہفتہ ۱۹۲۵ء کی علی الصباح اپنے نانا مرحوم کے گھر محلّہ قاضی واڑہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے موقع پر آپ کی والدہ کی کچھ سہیلیاں جن میں مس ڈیوس، مسز سکاٹلر، مس زہرا، مس میری اور دیگر مبارک باد دینے کے لیے آئیں۔ ناصرؔ کاظمی ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور چلے گئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔

ناصرؔ کاظمی کے دادا سید شریف الحسن پولیس انسپکٹر کے ساتھ ساتھ نصیر پورہ، نگر پورہ اور راجگڑھ کے بہت بڑے زمین دار تھے، ان کی نانی کا اسم گرامی امیر بی بی بنت سید جعفر علی تھا۔ ناصرؔ کاظمی کی پرورش میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ناصرؔ کاظمی کے والد کا نام سید محمد سلطان بن شریف الحسن تھا آپ نہایت ہی نمازی، پرہیزگار، مخلص اور ایماندار انسان تھے۔ ناصرؔ کاظمی کی والدہ کا نام کنیزہ محمدی ہے۔ یہ بہت ہی معصوم، نیک سیرت اور

رحم دل عورت تھیں۔ ناصؔر کاظمی کی بیگم کا نام شفیقہ بانو ہے جو بہت ہی نیک دل عورت ہے۔ ان کے صاحبزادوں میں بڑے بیٹے کا نام سید باصر سلطان ہے اور دوسرے بیٹے کا نام سید حسن رضا سلطان ہے۔ ناصؔر کاظمی ان لوگوں سے بہت پیار کرتے تھے۔

ناصؔر کاظمی نے ابتدائی تعلیم نیشنل ہائی اسکول پیشاور سے حاصل کی، اس کے بعد مختلف اسکولوں سے وہ وابستہ رہے اور پھر اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ایف۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ ان کو جدید علوم وفنون سے نہایت دلچسپی تھی اور وہ انجینئر یا سا سائنس دان بننا چاہتے تھے مگر ہائے رے قسمت کہ اردو ادب کے اعلیٰ پائے کے شاعر بن گئے۔

ناصؔر کاظمی ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت ایسی مسحور کن تھی کہ وہ کچھ بھی کرتے تو شاعر ہی معلوم ہوتے۔ ان کی مکمل شخصیت، شاعری کی ساحرانہ کیفیات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ان کی شخصیت کا بنیادی وصف حقیقت پسندی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری صرف عشق کے معاملات تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ وہ زندگی کی عام حقیقتوں کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔

ناصؔر کاظمی ایک اچھے، سچے اور دلآویز شاعر تھے ان کی یہی سچائی انھیں اپنے عہد کے لیے معنی خیز بناتی ہے۔ ناصؔر کاظمی کی شخصیت کا خاص وصف یہ ہے کہ سادگی اور صفائی ان کی جان ہے، خلوص اور صداقت ان کا جوہر ہے۔ برجستگی اور بے ساختگی، شگفتگی اور شادابی، توازن اور ہم آہنگی وغیرہ ان کی شخصیت کے خاص پہلو ہیں۔ ناصؔر کاظمی انوکھی شخصیت کے حامل تھے ان کے ہر کام میں جدت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں خود اعتمادی پائی جاتی ہے وہ کبھی بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے بلکہ ان کے یہاں اعتماد سے بھرپور با مقصد آواز موجود ہے۔

ناصؔر کاظمی کو موسیقی اور مصوری سے بہت زیادہ رغبت تھی۔ موسیقی اور مصوری کے موز پر ان کی گرفت مضبوط ہونے کی وجہ سے وہ اپنے معاصر غزل گویوں میں منفرد و مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کو گھوڑ سواری، شکار، فوٹو گرافی، فلم بینی، کرکٹ کا کھیل، کبوتر پالنے کا شوق، خوش خوراقی، خوش لباسی اور باغات کی سیر وغیرہ سے کافی دلچسپی تھی و نیز سگریٹ نوشی، چائے اور پان، ان کی پسندیدہ اشیاء تھے۔ ناصؔر کاظمی کو ٹیبل ٹاک پر خاصی مہارت حاصل تھی۔

ناصؔر کاظمی کی شخصیت پر اداسی بھی ماتم کناں ہے اور یہی اداسی ان کے گھر کی دیواروں کا مقدر بھی ہے۔ ان کی اداسی کی وجہ دراصل ان کا ماضی ہے۔ ناصؔر کاظمی خوش ہونا بھی اور خوش رہنا بھی جانتے ہیں ان کو پھولوں سے بہت دلچسپی تھی جنھیں دیکھ کر وہ خوش ہوتے تھے۔

ناصؔر کاظمی اپنی شخصیت اور شاعری کی وجہ سے بہت کامیاب ہوئے۔ ہر طرف ان کی شاعری کا بول بالا تھا اور لوگ ان کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ ان میں انفرادی فکر ہونے کی وجہ سے وہ جدید شعراء میں امتیاز رکھتے ہیں۔

ناصؔر کاظمی کے دوستوں میں رسالے کے مدیران، ناقدین، دانشور، ریڈیو اور ٹی وی کے دوست احباب، سیاسی افراد کے علاوہ تخلیقی ادب کے نمائندگان بھی شامل تھے جنھوں نے شروع ہی سے ناصؔر کاظمی کے فن کو پہچانا اور ان کی حوصلہ افزائی کی اور ناصؔر کے بارے میں لکھا و نیز ان کو ادب میں بہ خوبی واقف کرایا۔ اس کے بعد کا کام ان کی شاعری نے کیا جو قاری کو کئی اعتبار سے متوجہ کرتی ہے۔

ناصؔر کاظمی کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ اردو ادب کے علاوہ، فارسی، مغربی، چینی اور ہسپانوی ادب کا خاص مطالعہ کرتے تھے۔ انھوں نے اردو کے کلاسیکی شعراء کا انتخاب

بھی کیا۔ جن میں قابل ذکر میر، فراق وغیرہ ہیں۔

ناصر کاظمی بہ ظاہر شیعہ مذہب کے ماننے والے تھے مگر وہ صرف قرآن مجید کے مطابق زندگی گزارنے کے آرزومند تھے۔ ان کی قرآن پر گہری نظر تھی۔

ناصر کاظمی روزگار کی وجہ سے بہت پریشان تھے کیوں کہ ان کی کوئی مستقلاً جاب نہیں تھی بیروزگاری نے انھیں کمھلا کر رکھ دیا اور وہ بہت سے لوگوں کے مقروض ہو گئے۔ بالآخر ناصر کاظمی یکم اگست ۱۹۶۴ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے بہ طور اسٹاف آرٹسٹ وابستہ ہوئے اور ریڈیو پر غزلیں سنانے کے ساتھ ساتھ فیچرز بھی تخلیق کیا کرتے تھے ان کے ادبی فیچرز بہت مقبول ہوئے۔ ناصر کاظمی نے اردو کے تین مشہور ادبی رسائل اوراق، خیال اور ہمایوں کی ادارت کی۔

ناصر کاظمی کی تخلیقات میں برگِ نے ۱۹۵۲ء، دیوان ۱۹۷۲ء، پہلی بارش ۱۹۷۵ء، نشاطِ خواب ۱۹۷۷ء، سر کی چھایا ۱۹۸۱ء، خشک چشمے کے کنارے ۱۹۸۲ء اور ناصر کاظمی کی ڈائری ۱۹۹۵ء وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

لاہور کی ادبی فضاؤں میں ناصر کاظمی کی شاعری اپنے شباب پر تھی کہ ۴۷ برس کی عمر میں ۱۹۷۲ء کو وہ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ جتنی دیر تک وہ زندہ رہے بھرپور طریقے سے زندہ رہے۔

ناصر کاظمی جدید دور کے عظیم شاعر گزرے ہیں ان کو چھوٹی بحروں کے علاوہ علامتوں واستعاروں کے استعمال پر خاصا عبور حاصل ہے۔ یہ حقیقتاً متنوع موضوعات کے شاعر ہیں۔ انھوں نے زندگی کے حسن کے متعدد پہلوؤں اور ان کی رنگارنگی کو اپنے اشعار میں سمیٹا ہے ان کی شاعری اپنی تمام تر دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے جس کا اندازہ ان کی شاعری سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

کس سے کہوں کوئی نہیں سوگئے شہر کے مکین
کب سے پڑی ہے راہ میں میت شہر بے کفن

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں سماجی ناہمواریوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسے اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

ان کی شاعری میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید موضوعات پر بھی اشعار اور نظمیں ملتی ہیں۔

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیال یار کی چادر ہی لے چلیں

اس کے علاوہ ناصر کاظمی نے تقسیم ہند، ماضی کی یاد، ہجرت کے تاثرات، غم ذات اور غم روزگار وغیرہ جیسے موضوعات کو بہت اہمیت دی۔

ناصر کاظمی کی شاعری کی نشو ونما ۱۹۴۰ء کے آس پاس ہوئی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں ناصر کاظمی کو آشوب خیز قیامت سے دوچار ہونا پڑا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں حقیقت سے بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہوگئے ہیں

ناصر کاظمی کو فطرت سے بہت زیادہ لگاؤ ہے ان کی زبان سادہ اور پرُ کار تھی اور وہ بہت کم لفظوں میں خیال وخواب کی متنوع تصویریں سجائے ہیں۔ ان کے کلام میں عشقیہ واردات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ وہ کلاسیکی شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے ناصر کاظمی نے

اپنی شاعری میں فارسی زبان سے بھی کام لیا ہے کیوں کہ فارسیت ان کے مزاج کا خاصہ ہے ناصر کاظمی کی شاعری میں تجربات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے انھوں نے اپنی شاعری میں فسادات کا ذکر کرتے ہوئے صرف واقعہ نگاری سے کام نہیں لیا بلکہ انسانی اقدار کی پامالی کا ذکر بھی کرتے ہیں اور اس کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ان کے یہاں بیشتر اشعار تقسیم، ہجرت اور فسادات پر مبنی ہیں۔

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں تلمیحات کے علاوہ نادر تشبیہات، استعارات اور علامتوں کے ساتھ ساتھ پیکر تراشی سے بھی کام لیا ہے۔

ناصر کاظمی کی تخیلی فضا بہت اونچی ہے۔ ان کی تخیلی فضا کا اندازہ ان کی شاعری سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے نہ صرف ان کے تخلیقی شعور کو سمجھنے میں آسانی ہوگی بلکہ ان کی تعین قدر کے مسئلے کو سلجھانے میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔

ناصر کاظمی ایک عمدہ غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو ان کی زندگی ہی میں پہچانا گیا۔

پیکر جسم کو کہتے ہیں۔ جسم وہ ہے جسے ہم دیکھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، چکھ سکتے ہیں، آواز کا بھی ایک طرح کا جسم ہے لہذا جسم کو ہم سن سکتے ہیں اور سونگھ سکتے ہیں۔ لیکن چوں کہ شاعر پر مختلف طرح کی کیفیات گزرتی رہتی ہیں اور ان کیفیات کا کوئی جسم نہیں ہوتا، انھیں نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ سونگھا یا چکھا جا سکتا ہے جب شاعر اپنی کیفیات کو لوگوں تک پہنچاتا ہے تو وہ جسم تراشتا ہے اور اس کے توسط سے وہ لوگوں تک پہنچاتا ہے اس کو پیکر کہتے ہیں۔

چناں چہ مختلف لغات کے حوالے سے پیکر کے لغوی معنی اس طرح سے ہے جیسے چہرہ، شکل، خیالی تصویر، شکل وصورت، صورت، شبیہ، عکس، بصری ادراک کے ذریعہ

احساس، حسی کیفیات کی از سرِ نو تشکیل وغیرہ۔

پیکر ایک انگریزی اصطلاح ہے جس کے معنی Collective images کے ہیں۔ اردو ادب میں پیکر کی جھلک وصف، مصوری اور محاکات کی تعریفوں میں نظر آتی ہے۔ پیکر دراصل نام سے نیا ہے مگر موضوع کے اعتبار سے نیا نہیں ہے بلکہ یہ لفظی و معنوی صنعتوں کا خاندان معلوم ہوتی ہے پیکر نہایت ہی بلیغ اور بامعنی ہوتے ہیں۔

پیکر دراصل، شعر کے فن میں زبان کا ایسا اہم عنصر ہے جس کے ذریعہ کوئی بھی تخلیق اپنی آب و تاب کے ساتھ ابلاغ کے مرحلے سے گزرتی ہے اس لیے پیکر شبیہ یا استعارہ کی طرح صرف شعر کی سجاوٹ نہیں کرتا بلکہ شعر کے مفہوم کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ پیکر کے دو مفہوم مقبول عام و خاص ہے ایک نفسیاتی و تجریدی اور دوسری لسانی۔ پیکر کی جامع تعریف ان دونوں کے امتزاج کے بغیر ممکن نہیں۔

پیکر تراشی کے ذریعہ دراصل شاعر کے ذہنی خیالات و احساسات کا شعوری و لاشعوری تجربات و مشاہدات کا وہ انکشاف ہے جو علم بیان کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کے توسط سے کلام میں دلکشی واثر انگیزی پائی جاتی ہے۔

پیکر تراشی دراصل یادوں اور تجربوں کو ذہنی اور محسوساتی پیچیدگی کو اشیاء اور مناظر کے وسیلے سے پیش کرتا ہے۔ ایسے پیکر جو خارجی دنیا سے مطابقت رکھتے ہوئے ذہن و دل کی عجیب و غریب دنیا کو پیش کرتے ہیں واضح پیکر کہے جاسکتے ہیں۔

پیکر دراصل حسی تجربے کا لفظی اور شعری اظہار ہے جو حواس خمسہ میں سے کسی ایک یا زائد کو متاثر کرے اور یہ تاثر ایسا ہے جو شعر میں موجود الفاظ سے بننے والی تصویروں کے ذریعہ احساس اور ادراک کی سطحوں تک پہنچتا ہے۔ پیکر تراشی کے ذریعہ شاعر ایسی فضا تخلیق کرتا ہے کہ ہم مناظر کو دیکھنے، آوازوں کو سننے اور بعض کیفیات کو لمس،

ذائقہ اور شامہ کی مدد سے محسوس کرنے لگتے ہیں۔

پیکر تراشی سے متعلق تعریفوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) ذہنی پیکر، (۲) مجازی پیکر، (۳) تجسیمی پیکر۔

تشبیہ، استعارہ، علامت نگاری، محاکات، تمثیل اور تجسیم سے جب پیکر کا تقابل کیا گیا تو اس بات کا انکشاف ہوا کہ ان میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ لہذا پیکر ایک ایسی صنعت ہے جو الفاظ کے معنی میں تبدیلی پیدا کرتی ہے جو علامت وغیرہ سے قریب ہے یعنی کہ جو کام علامت وغیرہ کا ہے وہی پیکر کا بھی ہے لیکن منفرد انداز میں۔

پیکر تراشی دراصل شاعری کا دل ہے اور یہ شعر کے حسن کو نکھارتی ہے، کلام میں سلاست اور روانی کی کیفیات پیدا کرتی ہے اس کے علاوہ اس کے ذریعہ شاعر کے کلام کے ساتھ ساتھ شاعر تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے پیکر تراشی کا تعلق دراصل جذبات سے، نفسیات سے، فنون لطیفہ سے اور تشبیہ استعارے سے ہوتا ہے۔

پیکر تراشی کے نام سے یہ دھوکا نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر صرف ایسے پیکر تراش سکتا ہے جو صرف بصارت سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ بصری کے علاوہ، سمعی اور ذوقی پیکر بھی تراشے جاسکتے ہیں جنھیں سنا جاسکتا ہے اور چکھا جاسکتا ہے۔ حواس خمسہ کے اعتبار سے پیکر کو پانچ حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) بصری پیکر، (۲) سمعی پیکر، (۳) شامی پیکر، (۴) لمسی پیکر اور (۵) مذوقی پیکر۔ اس کے علاوہ بھی پیکر کے کئی ایک اقسام ہیں جس کا ذکر مقالے میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔

علامت پسندی کی طرح پیکریت بھی ایک تحریک ہے چوں کہ پیکریت کا تعلق شاعری سے صدیوں پرانا ہے لہذا دو ہزار سال قبل شاعری کی یہ تعریف کہ ''شاعری لفظی

مصوری ہے'' کی وجہ سے پیکریت بین الاقوامی سطح پر شاعری کے ایک عام رجحان کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

جدید شعرا تشبیہ وغیرہ سے کام لینے کے بجائے دوسری صنعتوں کو زیادہ ترجیح دے رہے ہیں جن میں پیکریت اہم کردار انجام دیتا ہے پیکر دراصل شعر کی تزئین نہیں کرتا بلکہ یہ شعر کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ناصر کاظمی نے تقسیم کے وقت جو حالات دیکھے جو فسادات دیکھے اس کو اپنی شاعری میں پیکروں کی مدد سے پیش کیا ان کو پیکر تراشنے میں ماحول کے ساتھ ساتھ مناظر بھی بہت سودمند ثابت ہوئے۔ ناصر کاظمی کے پیکر بہ یک وقت بصری، سمعی، شامی اور لمسی کیفیات کو حرکت میں لاتے ہیں۔

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں جن حواس کو سب سے زیادہ استعمال کیا ہے وہ دیکھنے اور سننے کی حواس ہیں۔

پیکر تراشی ایک جدید شعری روایت ہے جس کے تعلق سے یہ گمان کیا جاتا تھا کہ پیکر، محاکات ہی ہے مگر تحقیق کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ پیکر اور محاکات میں بہت فرق پایا جاتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں رہتی اور یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہی پیکر ہے اور یہی محاکات۔ لہذا امکنہ حد تک ان میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے علاوہ پیکر تراشی کے نت نئے اقسام کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا ذکر مقالے کے تیسرے باب میں تفصیل سے کیا گیا ہے و نیز پیکر تراشی کی تاریخ کو زمانی اعتبار سے درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امیجری کی اہمیت کو اردو شاعری میں سمجھا جا رہا ہے اور اس تحریک کے خاتمے کے بعد آج بھی شاعری میں پیکر تراشی کا استعمال کیا جا رہا ہے شاید وہ دن دور نہیں جب شاعری اور پیکر تراشی لازم و ملزوم قرار پائیں گی۔

کتابیات

کتابیں

سلسلہ نمبر	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	ابوالکلام قاسمی	شاعری کی تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	ندارد
2	ارشاد علی خان، پروفیسر	جدید اصول تنقید	کتابی دنیا، دہلی	2001ء
3	امتیاز بلوچ	حاصل مطالعہ (تنقیدی مضامین)	بیکن بکس گول باغ، گلگشت کالونی، ملتان	1988ء
4	انیس اشفاق	اردو غزل میں علامت نگاری	اترپردیش اردو اکادمی	1995ء
5	بشیر بدر، ڈاکٹر	آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	انجمن ترقی اردو، نئی دہلی	1981ء
6	توقیر احمد خاں، ڈاکٹر	شعریات بال جبریل	ناصی پریس، میرٹھ	دسمبر 1995ء
7	حامدی کاشمیری، ڈاکٹر	امکانات (تنقیدی مقالات)	جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی	1987ء
8	خورشید عالم، ڈاکٹر اور وسیم بیگم، ڈاکٹر	اردو شاعری: انتخاب	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2002ء
9	رفعت اختر، ڈاکٹر	علامت سے امیج تک	نازش بک سنٹر، دہلی	جولائی 1995ء
10	ساجد امجد، ڈاکٹر، پروفیسر	اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی باثرات	الوقار پبلی کیشنز	2003ء

11	سلیم اختر، ڈاکٹر	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے 2000ء تک	کتابی دنیا، دہلی	2002ء
12	سلیم شہزاد	جدید شاعری کی ابجد	منظر نما پبلیشرز (مالیگاؤں)	1983ء
13	سہیل احمد، ڈاکٹر	طرفیں	سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار، لاہور	1988ء
14	سید حسین محمد جعفری، ڈاکٹر اور احمد سلیم	پاکستانی معاشرہ اور ادب	پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی	اپریل 1987ء
15	شمس الرحمٰن فاروقی	شعر، غیر شعر اور نثر	شب خون، کتاب گھر ۳۱۳، رانی منڈی	اکتوبر 1973ء
16	شمس الرحمٰن فاروقی	اثبات و نفی	لبرٹی آرٹ پریس، دہلی	ستمبر 1986ء
17	شمیم حنفی	نئی شعری روایت	مکتبہ جامع، نئی دہلی لمیٹڈ	1978ء
18	شمیم حنفی	غزل کا نیا منظر نامہ	مکتبہ الفاظ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ	1981ء
19	شیخ صلاح الدین	ناصر کاظمی ایک دھیان	آغاز پبلیشرز 8، بی دربار مارکٹ، لاہور	جولائی 1991ء
20	عبادت بریلوی، ڈاکٹر	جدید شاعری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1983ء
21	عبادت بریلوی، ڈاکٹر	غزل اور مطالعہ غزل	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2005ء
22	علیم صبا نویدی	پاکستان میں اردو شاعری	ٹمل ناڈو، اردو پبلی کیشنز، چینائی	2008ء
23	عنوان چشتی، ڈاکٹر	اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25	جون 1977ء
24	قاضی مشتاق احمد	اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک	مکتبہ جدید، دریا گنج، نئی دہلی	2002ء
25	قمر رئیس	معاصر اردو غزل	اردو اکادمی، دہلی	1994ء
26	کامل قریشی، ڈاکٹر	اردو غزل	اردو اکادمی، دہلی	مارچ 1987ء

27	گوپی چند نارنگ	بیسویں صدی میں اردو ادب	ساہتیہ اکادمی	2002ء
28	محمد حسن، پروفیسر	جدید اردو ادب	جامع نئی دہلی لمیٹڈ	1974ء
29	معین لدین عقیل، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو غزل	طارق منزل، بر ہاتو ہاؤسنگ رانچی	1981ء
30	ممتاز الحق، ڈاکٹر	جدید غزل کا فنی، سیاسی و سماجی مطالعہ	ایجوکیشنل پبلشینگ ہاؤس، دہلی	1998ء-I 2004ء-II
31	منظر اعظمی	اردو میں تمثیل نگاری	انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی	1992ء
32	منظر اعظمی	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنو)	1996ء
33	منظر عباس نقوی، ڈاکٹر	نثر نظم اور شعر	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1978ء
34	ناصر کاظمی	خشک چشمے کے کنارے	مکتبہ خیال، لاہور	II اپریل 1986ء
35	ناصر کاظمی	ناصر کاظمی کی ڈائری (چند پریشان کاغذ)	مکتبہ خیال، لاہور	اپریل 1995ء
36	ناصر کاظمی	کلیات ناصر	فرید بک ڈپو لمیٹڈ، دہلی	جولائی 2005ء
37	وہاب اشرفی	تاریخ ادب اردو جلد III ابتدا سے 2000ء تک	ایجوکیشنل پبلشینگ ہاؤس دہلی	2007ء

لغات

سلسلہ نمبر	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	ادارہ تصنیف وتالیف	اعجاز اللغات، جدید اردو	بک کارپوریشن، دہلی	2004ء
2	شان الحق حقی	آکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری	آکسفرڈ یونیورسٹی	2003ء

3	عتیق اللہ	ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ جلد(A تا D)	مکتبہ جامع لمیٹڈ اردو بازار، دہلی	1995ء
4	عمر فاروق	اصطلاحات نقد و ادب	اردو اکادمی نئی دہلی	2004ء
5	الحاج مولوی فیروزالدین	جامع فیروز اللغات (نیا ایڈیشن)	ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس، نئی دہلی بار 1	2006ء

رسائل

سلسلہ نمبر	رسالہ	شمارہ	جلد	مقامِ اشاعت		پتہ	ماہ و سال
1	آج کل	8	36	نئی دہلی	ماہ نامہ	ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی 110001	مارچ 1978ء
2	آج کل	9	62	نئی دہلی	ماہ نامہ	ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی 110001	اپریل 2004ء
3	خبرنامہ	7 تا 10	36	اتر پردیش	ماہ نامہ	سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنو 226010	جنوری تا اپریل 2008ء
4	ذہن جدید	36	12	دہلی	سہ ماہی	کاسموا پارٹمنٹ لین، 12، ذاکر نگر، نئی دہلی 250	مارچ تا اگست 2003ء
5	ذہن جدید	61	15	نئی دہلی	سہ ماہی	ذاکر نگر، نئی دہلی 25	مارچ 2005ء
6	شاعر	10	5	بمبئی	ماہ نامہ	دیناناتھ بلڈنگ پی۔بی مارگ، بمبئی	1979ء

7	فکرو تحقیق	4	11	نئی دہلی	سہ ماہی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ۔ I، ونگ 6، آر۔ کے پورم نئی دہلی 110066	اکتوبر، نومبر، دسمبر 2008ء

مقالے

سلسلہ نمبر	مقالہ نگار	مقالہ کا نام		
1	عابدہ رخسانہ	استعارہ اور علامت (ایک نظریاتی مطالعہ)	غیر مطبوعہ	حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی
2	محمد جعفر	اردو میں غزل مسلسل روایت اور فن	غیر مطبوعہ	حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی

KI SHAYERI MEIN
PAIKAR TARASHI

Sumaiyah Tamkeen

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com